

تعارفِ قرآن

مع

عظمتِ قرآن

از

ڈاکٹر اسرار احمد

منافع کرو



تنظیمِ اسلامی

تعارفِ قرآن

مع

عظمتِ قرآن

ذ
ڈاکٹر اسرار احمد

مرتبہ:

حافظ خالد محمود خضر

تنظیمِ اسلامی

67 شارع اقبال روڈ، مرکزی شاہراہ، لاہور فون: 6318838-6388838

گیس: 8271241، ای میل: markaz@tarasent.org

وبسائٹ: www.tarasent.org

طبع اول (اپریل 2008ء): 1100

ناشر: تنظیم اسلامی پاکستان

مطبع: آئیڈیل پرنٹنگ پریس لاہور

مقام اشاعت: 67- ایف علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

عرض مرتب

رب کائنات نے انسانِ اول (آدم علیہ السلام) کی تخلیق کے بعد اس کے جسدِ خاکی میں اپنی روح پھونکی اور اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا۔ اس منصب پر تقرر کے وقت آدم کو یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرائی گئی تھی کہ اُس کا اور تمام جہان کا معبود مالک اور حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور یہ دنیا اس کے لیے دارالامتحان ہے۔ اس دنیا میں انسان کو اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے کہ وہ زمین پر حاکم نہیں، خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے، اسے یہاں اپنے معبودِ واحد کا بندہ بن کر رہنا ہے جو اُس کا خالق و مالک اور حاکم ہے اور اُسے اپنے حاکم اور مالک کی جانب سے جو ہدایات اور احکام موصول ہوتے رہیں گے انہیں اُس نے اپنا لاکھ عمل اور ضابطہٴ حیات بنانا ہے۔ انسان کے لیے یہی درست طرزِ عمل ہے جسے اپنا کر وہ اس دارالامتحان میں کامیاب قرار پائے گا اور اپنے حاکم اور مالک کی رضا کے نتیجے میں ابدی راحت و مسرت کے گھر یعنی جنت کا مستحق ٹھہرے گا۔

زمین پر انسانی زندگی کا آغاز جہالت کی تاریکیوں میں نہیں، بلکہ ہدایت کی روشنی میں ہوا اور انسان کا دستورِ حیات ”اسلام“ قرار دیا گیا۔ پہلا انسان پہلا نبی بھی تھا جس نے اپنی اولاد کو اللہ کی بندگی کا درس دیا۔ لیکن نسلِ آدم رفتہ رفتہ غفلت کا شکار ہوتی گئی اور اپنے دستورِ حیات سے منحرف ہو کر غلط راستوں پر بھٹکنے لگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں ہی میں سے انتخاب کر کے انبیاء و رسل کا سلسلہ جاری فرمایا جو اپنے ابنائے نوع کو اللہ کی بندگی اور دینِ اسلام کی پیروی کی دعوت دیتے رہے۔ لیکن ہر دور میں ایسا ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو اس دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوتی، اور جو لوگ انبیاء و رسل کی دعوت کو قبول کر لیتے وہ بھی رفتہ رفتہ بگاڑ کا شکار ہو جاتے اور اپنے پاس موجود آسمانی ہدایت کو من مرنسی کی تحریقات سے مسح کر دیتے۔

جیسے جیسے نوعِ انسانی شعور کی منازل طے کرتی گئی رب کائنات کی طرف سے نازل کردہ ہدایت بھی ارتقاء پذیر رہی، تا آنکہ نبی آخر الزمان محمد عربیؐ پر یہ ہدایت اپنی تکمیلی شان کے ساتھ قرآن حکیم کی صورت میں نازل ہو گئی جسے خود اس کے نازل کرنے والے نے

”الہدٰی“ (The Final Guidance) قرار دیا اور ہر قسم کی تحریف سے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں قرآن حکیم کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ ﷺ نے اس قرآن کی بنیاد پر نہ صرف دنیا کو ایک نظام عدل و اجتماعی عطا فرمایا بلکہ اس عادلانہ نظام پر مبنی ایک صالح معاشرہ بھی بالفعل قائم کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ نے اس قرآن کی راہنمائی میں انقلاب کے تمام مراحل طے کرتے ہوئے نوع انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا فرمادیا۔ چنانچہ یہ قرآن محض ایک کتاب نہیں ”کتاب انقلاب“ ہے اور اس شعور کے بغیر قرآن مجید کی بہت سی اہم حقیقتیں قرآن کے قاری پر مخفی نہیں ہو سکتیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور بانی عظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کو جنہوں نے اس دور میں قرآن حکیم کی اس حیثیت کو بڑے وسیع پیمانے پر عام کیا ہے کہ یہ کتاب اپنی دیگر امتیازی حیثیتوں کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کا آلہ انقلاب اور آپ کے برپا کردہ انقلاب کے مختلف مراحل کے لیے بحولہ منبہول (manual) بھی ہے لہذا اس کا مطالعہ آنحضرت ﷺ کی دعوت و تحریک اور انقلابی جدوجہد کے تناظر میں کیا جانا چاہیے اور اس کے قاری کو خود بھی ”منج انقلاب نبوی“ پر مبنی انقلابی جدوجہد میں شریک ہونا چاہیے۔ بصورت دیگر وہ قرآن حکیم کے معارف کے بہت بڑے خزانے تک رسائی سے محروم رہے گا۔ محترم ڈاکٹر صاحب پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی فضل و احسان ہے کہ اُس نے انہیں اپنی کتاب عزیز کی خدمت کے لیے جن لیا ہے۔ چنانچہ محترم ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اپنی زندگی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کر رکھی ہے بلکہ انہوں نے قرآن حکیم کے پیغام کی روشنی میں ”دینی فرائض کے جامع تصور“ کی ادائیگی کے لیے عظیم اسلامی کے نام سے ایک قافلہ بھی تشکیل دیا ہے۔

چشم نظر کتاب ”تعارف قرآن“ محترم ڈاکٹر صاحب کے چند خطابات کا مجموعہ ہے جسے مرتب کرنے کی سعادت راقم الحروف کے حصے میں آئی ہے۔ راقم کی شدید خواہش ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کے شہرہ آفاق ”ذوۃ ترجمہ قرآن“ کو بھی مرتب کر کے تحریری صورت میں پیش کر سکے۔ چنانچہ اللہ کے نام سے اس کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اس عظیم کام کے لیے یہ عاجز اللہ تعالیٰ سے اُس کی تائید و توفیق اور عزم و ہمت کا طلب گار ہے۔

فہرست

9	قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ	باب اول:
9	(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام	
10	کلام الہی: جملہ صفات الہیہ کا مظہر	
14	تورات کی گواہی	
16	لوح محفوظ اور صحف میں مطابقت	
17	کلام الہی کی تین صورتیں	
21	(۲) قرآن کا رسول اللہ ﷺ پر نزول	
21	نزول قرآن کی دو کیفیتیں: انزال اور تنزیل	
23	حکمت تنزیل	
26	قرآن کریم کا زمانہ نزول اور ارض نزول	
28	(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت	
33	چند متفرق مباحث	باب دوم:
33	قرآن مجید کی زبان	
37	قرآن کے اسماء و صفات	
39	لفظ قرآن کی لغوی بحث	
41	قرآن کا اسلوب کلام	
47	قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم	باب سوم:
47	آیات اور سورتوں کی تقسیم	
50	قرآن حکیم کی سات منازل	
53	رکوعوں اور پاروں کی تقسیم	

- 55 ترتیب نزولی اور ترتیب صحیف کا اختلاف
- 63 **باب چہارم:** تدوین قرآن
- 71 **باب پنجم:** قرآن مجید کا موضوع
- 85 **باب ششم:** فہم قرآن کے اصول
- 85 (۱) قرآن کریم کا اسلوب استدلال
- 87 (۲) قرآن حکیم میں محکم اور متشابہ کی تقسیم
- 89 (۳) تفسیر اور تائویل کا فرق
- 91 (۴) تائویل عام اور تائویل خاص
- 93 (۵) تذکرہ تدبیر
- 99 (۶) عملی ہدایات اور مظاہر طبعی کے ہارے میں متضاد طرز عمل
- 102 (۷) فہم قرآن کے لیے چند اصطلاح کی ضرورت
- 105 (۸) قرآن کے نزول سن اللہ ہونے کا ثبوت
- 109 **باب ہفتم:** اعجاز قرآن کے اہم اور نہایت ہی وجوہ
- 109 قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کا باہمی تعلق
- 111 محمد رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم
- 116 قرآن کا دعویٰ اور چیلنج
- 118 قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟
- 125 عہد حاضر میں اعجاز قرآن کا مظہر: علامہ اقبال
- 133 **باب ہشتم:** قرآن مجید سے ہمارا تعلق
- 133 قرآن "حبل اللہ" ہے!
- 140 مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

عظمت قرآن

- 145 قرآن وحدیث کے آئینے میں
- 147 رمضان المبارک کا دو گونہ پروگرام اور اس کا حاصل
- 149 عظمیت قرآن بربان قرآن ❁
- 150 عظمیت قرآن کی ایک تمثیل
- 151 افادیت قرآن کے چار پہلو
- 152 سورة الرحمن کی ابتدائی چار آیات
- 153 كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ
- 155 سورة الواقعة کی آٹھ آیات
- 157 عظمیت قرآن احادیث نبوی کے آئینے میں ❁
- 158 فتنوں سے بچاؤ کا راستہ
- 161 قرآن: ماضی حال اور مستقبل کا آئینہ
- 161 فیصلہ کن کتاب
- 163 ہدایت کا سرچشمہ
- 165 اللہ کی مضبوطی
- 166 قرآن: بڑھکتی ذکر
- 167 قرآن: صراط مستقیم
- 168 بے مثل و بے مثال کتاب
- 169 جو اہر علم و حکمت کا لامتناہی خزانہ
- 170 چنات کا قبول اسلام
- 171 حدیث کا کلائمکس
- 171 دعوت الی القرآن کا مدعا
- 173 قرآن مجید کی عظمت و فضیلت (حدیث کا متن اور ترجمہ)

قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ

تعارف قرآن مجید کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا ایمان یا اصطلاح عام میں ہمارا عقیدہ کیا ہے؟

قرآن حکیم کے متعلق اپنا عقیدہ ہم تین سادہ جملوں میں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) قرآن اللہ کا کلام ہے۔

(۲) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

(۳) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے اور کُل کا کُل من و عن موجود ہے اور اس کی

حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔

یہ تین جملے ہمارے عقائد کی فہرست کے اعتبار سے قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے پر کفایت کریں گے۔ لیکن انہی تین جملوں کے بارے میں اگر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے اور وقت نظر سے ان پر غور کیا جائے تو کچھ علمی حقائق سامنے آتے ہیں۔ تمہیدی گفتگو میں ان میں سے بعض کی طرف اجمالاً اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام

سب سے پہلی بات کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔

چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ

أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ﴾

”اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص بناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ

اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دو۔“

جب سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں جن میں مشرکین عرب کو آخری الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو چار ماہ کی مدت کے خاتمے کے بعد تمہارا قتل عام شروع ہو جائے گا تو اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کو ایک ہدایت یہ بھی دی گئی کہ یہ الٹی میٹم دیے جانے کے بعد اگر مشرکین میں سے کوئی آپ کی پناہ طلب کرے تو وہ آپ کے پاس آ کر مقیم ہو اور کلام اللہ کو سنے جس پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیا جائے۔ یعنی ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ وہیں اس سے مطالبہ کیا جائے کہ فیصلہ کرو کہ آیا تم ایمان لاتے ہو یا نہیں۔ اس وقت میں نے اس آیت کا حوالہ صرف ”کلام اللہ“ کے الفاظ کے لیے شہادت کے طور پر دیا ہے۔

کلام الہی: جملہ صفات الہیہ کا مظہر

قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں ہی اس کی اصل عظمت کا راز مضمر ہے۔ اس لیے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے اور اس میں متکلم کی پوری شخصیت ہویدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ کسی بھی شخص کا کلام سن کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے علم اور فہم و شعور کی سطح کیا ہے۔ آیا وہ تعلیم یافتہ انسان ہے، مہذب ہے، متمدن ہے یا کوئی اجڑا گنوار ہے۔ اس اعتبار سے درحقیقت یہ کلام اللہ اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات کا مظہر ہے اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا۔

فاش گویم آنچه در دل مضمر است

اس کتابے نیست چیزے دیگر است

مثل حق پنہاں و ہم پیدا ست این!

زندہ و پائندہ و گویا ست این!

(جو بات میرے دل میں چھپی ہوئی ہے وہ میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ یہ (قرآن حکیم) کتاب نہیں ہے، کوئی اور ہی شے ہے۔ چنانچہ یہ حق تعالیٰ کی

ذات کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔ نیز یہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا بھی ہے اور یہ کلام بھی کرتا ہے۔)

مختلف مفاہیم و معانی کے لیے اس شعر کا حوالہ دے دیا جاتا ہے، لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں اس کے ”چیزے دیگر“ ہونے کا کون سا پہلو اُجاگر کیا جا رہا ہے۔ اس میں درحقیقت سورۃ الحدید کے اس مقام کی طرف اشارہ ہو گیا ہے کہ: ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (آیت ۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ الاول بھی ہے اور الاخر بھی، وہ الظاهر بھی ہے اور الباطن بھی۔ اسی طرح علامہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کی بھی یہی شان ہے۔ نیز جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت الحی القیوم (آیت الکرسی، سورۃ البقرۃ) ہے اسی طرح یہ کلام بھی زندہ و پائندہ ہے، ہمیشہ رہنے والا ہے۔ پھر یہ صرف کلام نہیں، خود متکلم ہے۔

یہاں کلام اور متکلم کے مابین فرق کے حوالے سے متکلمین کی اس بحث کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذات حق کی صفات، ذات سے علیحدہ اور مستزاد ہیں یا عین ذات؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی مشہور نظم ”ابلیس کی مجلس شورئ“ میں اس بحث کا ذکر کیا ہے۔

ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات؟

امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

یہ علم کلام کا ایک نہایت ہی پیچیدہ، ناممکن اور عمیق مسئلہ ہے، جس پر بڑی بحثیں ہوئیں اور بالآخر متکلمین کا اس پر تقریباً اجماع ہوا کہ ”لَا عَيْنٌ وَلَا غَيْرٌ“ یعنی اللہ کی صفات کو نہ اس کی ذات کا عین قرار دیا جاسکتا ہے نہ اس کا غیر۔ اگر اس حوالے سے غور کریں تو قرآن حکیم بھی جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اسی کے ذیل میں آئے گا، یعنی نہ اسے اللہ کا غیر کہا جاسکتا ہے نہ اس کا عین۔ چنانچہ اس حوالے سے سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ قرآن مجید کی فی نفسہ عظمت کے ضمن میں اہم ترین ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَاَيْنَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنَاسٍ لِّعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١٣٣﴾

”اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔“

اس تمثیل کو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۳۳ کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طلبی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر حاضر ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ وہی طلبی تھی جس میں آپ علیہ السلام کو توراہ عطا کی گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطبہ و مکالمہ سے سرفراز فرمایا تو ان کی آتش شوق کچھ اور بھڑکی اور انہوں نے فرمائش کرتے ہوئے کہا: ﴿رَبِّ ارْنِي أَنْظُرَ الْبَيْتِ﴾ ”اے پروردگار! مجھے اپنا دیدار عطا فرما۔“ مخاطبہ و مکالمہ کے شرف سے تو نے مجھے مشرف فرمایا ہے اب ذرا مزید کرم فرما۔ اس پر جواب ملا: ﴿لَنْ تَرِنِي﴾ ”موسیٰ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے!“ ﴿وَلَكِنْ أَنْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ﴾ ”لیکن ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو“ میں اس پر اپنی ایک تجلی ڈالوں گا۔ ﴿فَإِنْ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرِنِي﴾ ”چنانچہ اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو پھر تم بھی گمان کر لینا کہ تم مجھے دیکھ سکو گے۔“ ﴿فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَوَّ مُوسَى صَيْعًا﴾ ”پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ ”دکھا دکھا“ ہو گیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔“

یہاں ”دکھا“ کے دونوں ترجمے کیے جاسکتے ہیں یعنی ریزہ ریزہ ہو جانا، ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا یا کوٹ کوٹ کر کسی شے کو ہموار کر دینا برابر کر دینا۔ جیسے سورۃ الفجر کی آیت ﴿كَلَّا إِذَا دُمِّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ میں ان معنوں میں وارد ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں پہاڑ کے بارے میں آیا ہے۔ یعنی وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا یا دب گیا زمین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی یہ تجلی دیکھی جو بالواسطہ تھی یعنی براہ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں بلکہ پہاڑ پر تھی اور حضرت موسیٰ بالواسطہ اس کا نظارہ کر رہے تھے لیکن خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت یہ ہوئی کہ ﴿خَوَّ مُوسَى﴾

صَعِقًا» ”حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔“

یہاں ذات و صفات باری تعالیٰ کی بحث کا ایک عقد وصل ہو جاتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ دب گیا یا پھٹ گیا، ریزہ ریزہ ہو گیا، اسی طرح قرآن مجید کے متعلق فرمایا:

﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْنَاَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾

یعنی کلام اللہ کی بھی وہی کیفیت اور تاثیر ہے جو کیفیت و تاثیر تجلی ذات الہی کی ہے۔ اس کہ قرآن اللہ کا کلام اور اللہ کی صفت ہے۔ تو تجلی صفات اور تجلی ذات میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ علامہ اقبال نے ایک جگہ اس بارے میں ذرا مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔

علامہ نے حضور ﷺ کی مدح فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے کہ۔

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوہ صفات

تو عین ذات می مگری و تسمی!

علامہ حضرت محمد ﷺ کا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے مقابل کر رہے ہیں کہ وہ تو تجلی صفات کے بالواسطہ نظارے ہی سے بے ہوش ہو کر گر گئے، لیکن اے نبی! آپ نے عین ذات کا دیدار کیا اور جسم کی کیفیت میں کیا۔ اس میں دو اعتبارات سے ملاحظہ پایا جاتا ہے۔ اول تو وہ تجلی، تجلی صفات نہیں تجلی ذات تھی جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر ڈالی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَلَمَّا فَجَّطْنِي رَبُّنَا لِلْجَبَلِ﴾ گویا یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ خود متجلی ہوا۔ دوسرے یہ کہ یہ خیال بھی مختلف فیہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں ذات الہی کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ ہمارے اسلاف میں یہ رائے بھی ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، لیکن اکثر و بیشتر کی رائے اس کے برعکس ہے اس لیے کہ وہاں بھی ”آیات“ کا ذکر ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا: ﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آیات جو وہاں حضور نبی اکرم ﷺ نے دیکھیں، اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔

﴿إِذْ يَغْشَى السُّورَةَ مَا يَفْغَىٰ مَا رَأَىٰ الْبَصَرُ وَمَا كَفَىٰ﴾ لَقَدْ رَأَىٰ

مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿۱۰﴾

”اُس وقت پیری پر چھارہا تھا جو کچھ کہ چھارہا تھا۔ نگاہ نہ چند حیاتی نہ حد سے تجاوز ہوئی۔ اور اُس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔“

اب اُس سے زیادہ بڑی آیات اور اس سے زیادہ بڑی تجلّی الہی اور کہاں ہوگی؟

لیکن دونوں اعتبار سے اس شعر میں مبالغہ ہے۔ البتہ اس آئیہ مبارکہ کے حوالے سے علامہ کے اس شعر۔

مثل حق پناہاں و ہم پیدا ست این!

زندہ و پائندہ و گویا ست این!

میں میرے نزدیک قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اور اس آیت مبارکہ کے حوالے سے وہ بات کہی جاسکتی ہے جو علامہ اقبال نے اس شعر میں کہی ہے۔

تورات کی گواہی

اب ذرا قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے حوالے سے ایک اور بات ذہن نشین کر لیجیے۔ تورات میں کتاب استثناء یا سطر استثناء جو صحف موسیٰ میں سے ایک صحیفہ ہے کے اٹھارہویں باب میں نبی اکرم ﷺ کے لیے جو پیشین گوئی بیان کی گئی ہے اس میں الفاظ یہی ہیں کہ:

”میں ان کے بھائیوں میں سے ان کے لیے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا اور وہ اُن سے وہی کچھ کہے گا جو میں اس سے کہوں گا۔“

میں نے یہاں خاص طور پر ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے کہ ”میں اُس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔“ یہاں ایک تو لفظ کلام آیا ہے جیسے کہ قرآن حکیم کی اس آیت میں آیا: ﴿حَتّٰی يَسْمَعَ كَلِمَ اللّٰهِ﴾ پھر ”کلام منہ میں ڈالنا“ کے حوالے سے قرآن مجید میں ایک لفظ دو مرتبہ آیا ہے وہ لفظ ”قول“ ہے یعنی قرآن کو قول قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ الحاقہ میں ہے:

﴿إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۝ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا
بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۝ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾

اور سورۃ النور میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُطَاعٍ
تَمَّ اٰمِيْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝﴾

اور اسی میں آگے چل کر آیا:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝﴾

قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان دو مقامات میں سے مؤخر الذکر کے متعلق تقریباً اجماع ہے کہ یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں۔ گویا قرآن کو ان کا قول قرار دیا گیا۔ اور سورۃ الحاقہ میں اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار دیا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے یہاں جن چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے کہ ”یہ کسی شاعر کا قول نہیں“ اور ”یہ کسی کاهن کا قول نہیں“ ان سے یقیناً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اللہ کا کلام پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اگر میں کتاب استثناء کے الفاظ استعمال کروں تو یہاں ”اللہ نے اپنا کلام ان کے منہ میں ڈالا“۔ تاہم ”ان کے منہ“ کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے وہ نہایت جلیل القدر فرشتے ہیں۔ بہر حال قول کا لفظ قرآن مجید کے لیے استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ابتداء کلام الہی حضرت جبرئیل کے قول کی شکل میں اتر اور پھر حضرت جبرئیل کے ذریعے سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ میں ڈالا گیا اور وہاں سے یہ قول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں لوگوں کے سامنے آیا اس لیے کہ یہ آپ ہی کی زبان مبارک سے ادا ہوا لوگوں نے اسے صرف آپ ہی کی زبان مبارک سے سنا۔ گویا یہ قول ’قول شاعر نہیں‘ یہ قول کاهن نہیں‘ یہ قول شیطان رجیم نہیں‘ بلکہ یہ قول رسول کریم ہے اور رسول کریم اولاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں‘ یہ لوگوں کے سامنے ان کے قول کی حیثیت سے آیا۔ پھر ثانیاً یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا قول ہے اس لیے کہ انہوں نے یہ قول حضور کو پہنچایا۔ اور اس کو آخری درجے تک پہنچانے پر یہ اللہ کا کلام ہے جس کے متعلق

تورات میں الفاظ آئے کہ ”میں اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔“

لوح محفوظ اور مصحف میں مطابقت

کلام ہونے کے حوالے سے تیسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ کلام اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات قدیم ہیں۔ اللہ کی ذات کی طرح اس کی صفات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ مادیت اور جسمانیت سے ماوراء ہے۔ یہی معاملہ اللہ کی صفات کا بھی ہے۔ چنانچہ کلام اللہ جسے حرف و صوت کی محدودیت سے اعلیٰ وارفع خیال کیا جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے حروف و اصوات کا جامہ پہنایا اور سید المرسلین ﷺ کے قلب مبارک پر بطریق تنزیل نازل فرمایا۔ یہی کلام لوح محفوظ میں اللہ کے پاس مندرج ہے جسے أم الكتاب یا کتاب مکنون بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے پاس موجود قرآن مجید یا مصحف کی عبارت بعینہ وہی ہے جو لوح محفوظ یا أم الكتاب میں ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی دستاویز کی صدقہ نقل ہو جو بغیر کسی شوشے کے فرق کے اصل کے مطابق ہو۔ چنانچہ سورۃ البروج میں فرمایا:

﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝ لِّمَن لَّا يُؤْتِي السَّمْعَ أَعْيُنًا ۝ لِّمَن لَّا يُؤْتِي السَّمْعَ أَعْيُنًا ۝ لِّمَن لَّا يُؤْتِي السَّمْعَ أَعْيُنًا ۝﴾

”یہ قرآن نہایت بزرگ و برتر ہے اور یہ لوح محفوظ میں ہے۔“

اسی کے متعلق سورۃ الواقعة میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝﴾

”یہ تو ایک کتاب ہے بڑی کریم بہت باعزت اور ایک ایسی کتاب ہے جو چھپی

ہوئی ہے۔ جسے چھوی نہیں سکتے مگر وہی جو بہت ہی پاک کر دیے گئے ہیں۔“

یعنی ملائکہ مقررین جن کے بارے میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

﴿فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ

بَرَّةٍ ۝﴾ (عبس)

”یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو کرم ہیں بلند مرتبہ ہیں پاکیزہ ہیں معزز اور

نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔“

درحقیقت یہ کتاب مکنوں ان فرشتوں کے پاس ہے، وہ تو تمہاری رسائی سے بغیر و
ماوراء ہے۔

یہی بات سورۃ الزخرف میں کہی گئی ہے:

﴿وَأَنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيَّ حَكِيمٌ ۝﴾

”یہ تو درحقیقت اصل کتاب میں ہمارے پاس محفوظ ہے، بڑی بلند مرتبہ اور
حکمت سے لبریز۔“

اُمّ کا لفظ جز اور بنیاد کے لیے آتا ہے۔ اسی لیے ماں کے لیے بھی عربی میں لفظ
”اُمّ“ استعمال ہوتا ہے، کیونکہ اسی کے بطن سے اولاد کی ولادت ہوتی ہے، وہ گویا کہ
بجزلہ اساس ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی اصل اساس لوح محفوظ میں ہے، کتاب مکنوں
میں ہے۔ مزید وضاحت کر دی گئی کہ ”لَدَيْنَا“ یعنی وہ اُمّ الکتاب جو ہمارے پاس ہے
اس میں یہ قرآن درج ہے۔ ”لَعَلِيَّ حَكِيمٌ“ اس قرآن کی صفات یہ ہیں کہ وہ بہت
بلند و بالا اور حکمت والا ہے، مستحکم ہے۔ وہ اللہ کا کلام اور نہایت محفوظ کتاب ہے۔ اسے
لوح محفوظ کہیں، کتاب مکنوں کہیں، یا اُمّ الکتاب کہیں، اصل کلام وہاں ہے۔ اسی
عالم غیب میں اسی عالم امر میں — جسے سوائے اُن پاک باز فرشتوں کے جن کی رسائی
لوح محفوظ تک ہو، کوئی مس نہیں کر سکتا، یعنی اس لوح محفوظ کے مضامین پر مطلع نہیں ہو
سکتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ پر اپنے اس کلام
کی تنزیل فرمائی اور اس کی عبارت کو تاقیام قیامت مصاحف میں محفوظ فرما دیا اور
تاپاک ہاتھوں سے چھونے سے منع فرما دیا۔

کلام الہی کی تین صورتیں

جب میں نے عرض کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ
تعالیٰ انسان سے کس طرح ہم کلام ہوتا ہے! قرآن مجید میں اس کی تین شکلیں بیان
ہوئی ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكَلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَجْهًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ

رَسُوْلًا قَبِيْحًا يٰۤاٰدِیْنِهٖ مَا یَشَآءُ ۗ اِنَّهٗ عَلٰی حٰكِمٍۭۭۭۭ ﴿۱۰۱﴾ (الشوری)

”کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی بیخامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ ان کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ برتر اور صاحب حکمت ہے۔“

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے اللہ تو ہر شے پر قادر ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے بلکہ کہا کہ انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہ راست کلام کرے کسی بشر کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرنے سوائے تین صورتوں کے یا تو وحی یعنی مخفی اشارے کے ذریعے سے یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کسی رسول (رسول مملک) کو بھیجتا ہے جو وحی کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہتا ہے۔

اب کلام الہی کی مذکورہ تین شکلیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے دو کے لیے لفظ وحی آیا ہے۔ درمیان میں ایک شکل ”مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ“ بیان ہوئی ہے۔ اس کا تذکرہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ اور یہ تو امر واقعہ ہے ہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے متحدہ مواقع پر اس صورت میں کلام فرمایا۔ پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب آگ کی کلاش میں کوہ طور پر پہنچے تو وہاں مخاطبہ ہوا۔ یہ مخاطبہ اور مکالمہ الہی حضرت موسیٰ کے ساتھ ”مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ“ ہوا تھا اسی لیے تو وہ آتش شوق بھڑکی تھی کہ۔

کیا قیامت ہے کہ چلن سے لگے بیٹھے ہیں

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!

ظاہر ہے کہ جب ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے تو ایک قدم اور باقی ہے کہ مجھے دیدار بھی عطا ہو جائے لیکن یہ مخاطبہ ”مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ“ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مخاطبہ شب معراج میں پردے کے پیچھے سے ہوا۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ (یعنی ذات الہی) کا دیدار حاصل ہوا، لیکن میری رائے سلف میں سے ان حضرات کے ساتھ ہے جو اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی اہمیت کی حامل ہیں، انہوں نے حضور ﷺ سے لازماً ان چیزوں کے بارے میں استفسار کیا ہوگا، چنانچہ ان کی بات کے متعلق تو ہم یقین کے درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ سے مرفوع ہے۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ ”نورِ اُنّی یومی؟“ یعنی اللہ تو نور ہے، اسے کیسے دیکھا جاسکتا ہے؟ (مسلم، کتاب الایمان، عن ابی ذر رضی اللہ عنہ) نور تو دوسری چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے، نور خود کیسے دیکھا جاسکتا ہے! بہر حال میری رائے ہے کہ یہ گفتگو بھی من وراء حجاب تھی۔ وہ وراء حجاب گفتگو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر مکالمہ و مخاطبہ میں نصیب ہوئی، اسی وراء حجاب ملاقات اور گفتگو سے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں ”عِنْدَ سِنْدْرَةِ الْمُتَهَيِّی“ مشرف فرمایا۔

البتہ وحی براہ راست بھی ہے، یعنی بغیر فرشتہ کے واسطہ کے۔ دوسری قسم کی وحی فرشتے کے ذریعے سے ہے اور قرآن مجید سے جس بات کی طرف زیادہ راہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن وحی ہے بواسطہ ”مَلَكٌ“۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿تَوَلَّیْہِ الرُّوحُ الْأَمِیْنُ ﴿۱۶۷﴾ عَلٰی قَلْبِكَ.....﴾ (الشعراء) ”اسے لے کر آپ کے دل پر روح امین اترا ہے۔۔۔“ اور: ﴿لَآ اِنَّہٗ ذُرَّۃٌ عَلٰی قَلْبِكَ﴾ (البقرہ: ۹۷) ”پس اسے جبریل نے ہی آپ کے قلب پر نازل کیا ہے۔“ البتہ فرشتے کے بغیر وحی، یعنی دل میں کسی بات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ڈال دیا جانا، یعنی ”الہام“ کا ذکر بھی حضور ﷺ نے کیا ہے اور اس کے لیے حدیث میں ”نَفَثَ فِی الرُّوْحِ“ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی کسی نے دل میں کوئی بات ڈال دی، کسی نے پھونک مار دی بغیر اس کے کہ کوئی آواز سننے میں آئی ہو۔ ایک کیفیت مصلحۃ الجرس کی بھی تھی۔ حضور کو گھنٹیوں کی سی آواز آتی تھی اور اس کے بعد حضور ﷺ کے قلب مبارک پر وحی نازل ہو جاتی تھی۔

بہر حال یقین کے ساتھ تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن میرا گمان غالب ہے کہ دوسری

قسم کی وحی (بذریعہ فرشتہ) پر پورے کا پورا قرآن مشتمل ہے۔ اور وحی براہ راست یعنی ”القاء“ تو درحقیقت وحی خفی ہے جس کی وضاحت انگریزی کے دو الفاظ کے درمیان فرق سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ ایک لفظ ہے inspiration اور دوسرا revelation جس کے ساتھ ایک اور لفظ verbal revelation بھی اہم ہے۔ inspiration میں ایک مفہوم ایک خیال یا تصور انسان کے ذہن و قلب میں آ جاتا ہے جب کہ revelation باقاعدہ کسی چیز کے کسی پر reveal کیے جانے کو کہتے ہیں۔ اور اس میں بھی عیسائیوں کے ہاں ایک بڑی بحث چل رہی ہے۔ وہ revelation کو مانتے ہیں لیکن verbal revelation کو نہیں مانتے بلکہ ان کے نزدیک صرف مفہوم ہی انبیاء کے قلوب پر نازل کیا جاتا تھا جسے وہ اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس بارے میں مستقل اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہ لفظ بھی وحی ہے اور معنا بھی لفظ بھی اللہ کا کلام ہے اور معنا بھی یعنی یہ verbal revelation ہے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ لاہور ہی میں غالباً ایف سی کالج کے پرنسپل اور علامہ اقبال کے درمیان پیش آیا تھا۔ وہ دونوں کسی دعوت میں اکٹھے تھے کہ ان صاحب نے حضرت علامہ سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بھی verbal revelation کے قائل ہیں! اس پر علامہ نے اُس وقت جو جواب دیا وہ اپنی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی ہاں میں verbal revelation کو نہ صرف مانتا ہوں بلکہ مجھے تو اس کا ذاتی تجربہ حاصل ہے۔ چنانچہ خود مجھ پر جب شعر نازل ہوتے ہیں تو وہ الفاظ کے جامے میں ڈھلے ہوئے آتے ہیں میں کوئی لفظ بدلنا چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری اپنی تخلیق نہیں ہیں بلکہ مجھ پر نازل کیے جاتے ہیں۔ تو یہ درحقیقت کسی کو جواب دینے کا وہ انداز ہے جس کو عربی میں ”الاجوبۃ المسکتة“ یعنی چپ کر دینے والا جواب کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جواب ہے جس کے بعد فریق ثانی کے لیے کسی قبل و قال کا موقع ہی نہیں رہتا۔

بہر حال کلام الہی واقعتاً verbal revelation ہے جس نے اولاً قول جبرائیل کی شکل اختیار کی۔ حضرت جبرائیل کے ذریعے قول کی شکل میں نازل ہوا۔ اور پھر زبان محمدی سے قول محمدی کی شکل میں ادا ہوا۔ تو یہ درحقیقت revelation ہے؛ inspiration نہیں؛ اور محض revelation بھی نہیں بلکہ verbal revelation ہے؛ یعنی معانی، مفہوم اور الفاظ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ بحیثیت مجموعی اللہ کا کلام ہے۔

(۲) قرآن کا رسول اللہ ﷺ پر نزول

قرآن مجید کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نزول کے ضمن میں بھی چند باتیں نوٹ کر لیں۔ پہلی بحث تو ”نزول“ کی لغوی بحث سے متعلق ہے۔ یہ لفظ نَزَلَ، يَنْزِلُ ثلاثی مجرد میں بھی آتا ہے۔ تب یہ فعل لازم ہوتا ہے، یعنی ”خود اترنا“۔ قرآن مجید کے لیے ان معنوں میں یہ لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً: ﴿وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَّلَهُ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۵) ”ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے“۔ یہاں یہ فعل لازم آ رہا ہے، یعنی نازل ہوا۔ عام طور پر فعل لازم کو متعدی بنانے کے لیے اس فعل کے ساتھ کسی صلہ (preposition) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فعل نَزَلَ ”ب“ کے ساتھ متعدی ہو کر بھی قرآن مجید میں آیا ہے، بمعنی اُس نے اتارا، جیسے جَاءَ ”وہ آیا“ سے جَاءَ بِهِ ”وہ لایا“۔ مثلاً: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ﴾ (الشعراء) یعنی رُوح الامین (جبرائیل) نے اس قرآن کو اتارا ہے محمد ﷺ کے قلب مبارک پر۔

نزول قرآن کی دو کیفیتیں: انزال اور تنزیل

ثلاثی مزید فیہ کے دو ابواب یعنی باب افعال اور باب تفعیل سے یہ لفظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ دونوں ابواب سے یہ فعل متعدی کے طور پر بمعنی ”اتارنا“ استعمال ہوتا ہے، یعنی أَنْزَلَ، يَنْزِلُ، أَنْزَلْنَا اور نَزَّلْنَا، يَنْزِلُونَ، تَنْزِيلًا۔ ان

دونوں کے مابین فرق یہ ہے کہ باب افعال میں کوئی فعل دفعہ اور یک دم کر دینے کے معنی ہوتے ہیں جبکہ باب تفعیل میں وہی فعل تدریجاً، اہتمام، توجہ اور محنت کے ساتھ کرنے کے معنی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین فرق کو ”اعلام“ اور ”تعلیم“ کے معنی کے فرق کے حوالے سے بہت ہی نمایاں طور پر اور جامعیت کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔

”اعلام“ کے معنی ہیں بتا دینا۔ یعنی آپ نے کوئی چیز پوچھی تو جواب دے دیا گیا۔ چنانچہ ”Information Office“ کو عربی میں ”مکتب الاعلام“ کہا جاتا ہے۔ جبکہ ”تعلیم“ کے معنی ذہن نشین کرانا اور تھوڑا تھوڑا کر کے بتانا ہے۔ یعنی پہلے ایک بات سمجھا دینا، پھر دوسری بات اس کے بعد بتانا اور اس طرح درجہ بدرجہ مخاطب کے فہم کی سطح بلند سے بلند تر کرنا۔

اگرچہ قرآن مجید کے لیے لفظ ”انزال“ اور اس سے مشتق مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لیکن بکثرت لفظ ”تنزیل“ استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی اصل شان تنزیلی شان ہے، یعنی یہ کہ اس کو تدریجاً، رفتہ رفتہ، تھوڑا تھوڑا اور نجماً نجماً نازل کیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے حضور ﷺ پر نزول کے لیے صحیح تر اور زیادہ مستعمل لفظ قرآن حکیم میں تنزیل ہے، تاہم دو مقامات پر لَيْلَةَ الْقَدْرِ اور لَيْلَةَ مَبَارَكَةٍ کے ساتھ انزال کا لفظ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اَنَا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر) اور: ﴿اَنَا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مَبَارَكَةٍ﴾ (الذخاں: ۳) اسی طرح ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرہ: ۱۸۵) میں بھی لفظ ”انزال“ استعمال ہوا ہے۔ پھر حضور ﷺ پر نزول کے لیے بھی کہیں کہیں لفظ ”انزال“ آیا ہے، اگرچہ اکثر و بیشتر لفظ ”تنزیل“ ہی آیا ہے۔ اس کی تقریباً مجمع علیہ تاویل یہ ہے کہ پورا قرآن دفعہ لوح محفوظ سے سائے دنیا تک لیلۃ القدر میں نازل کر دیا گیا، جسے ”لیلۃ مبارکہ“ بھی کہا گیا ہے جو کہ رمضان المبارک کی ایک رات ہے۔ لہذا جب رمضان مبارک کی لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ میں قرآن کے نزول کا ذکر ہوا تو لفظ انزال استعمال ہوا۔ قرآن مجید سائے دنیا پر ایک ہی بار مکمل طور پر نازل ہونے کے بعد وہاں سے تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کر کے محمد رسول اللہ ﷺ پر

نازل ہوا۔ لہذا حضور ﷺ پر نزول کے لیے اکثر و بیشتر لفظ تنزیل استعمال ہوا ہے۔

لفظ تنزیل کے ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ نہایت اہم ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَيَّ
رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ مِنْ قَبْلِهِ﴾

”اے ایمان والو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے پہلے نازل کی۔“

توراة تختیوں پر لکھی ہوئی، مکتوب شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ وہ چونکہ دفعہ اور جملہ واحدہ دے دی گئی اس لیے اس کے لیے لفظ انزال آیا ہے جبکہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے بائیس تیس برس میں نازل ہوا۔ لہذا اسی کے ضمن میں لفظ ”نَزَّلَ“ استعمال ہوا۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیت میں ”تنزیل“ اور ”انزال“ ایک دوسرے کے بالکل مقابلے میں آئے ہیں۔ گویا یہاں ”مُعْرِفُ الْأَشْيَاءِ بِأَضْدَادِهَا“ (چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں) کا اصول درست بیٹھتا ہے۔

حکمتِ تنزیل

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تنزیل کی حکمت کیا ہے؟ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا اور ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ قرآن مجید میں اس کی دو حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔

ایک تو یہ کہ لوگ شاید اس کا تحمل نہ کر سکتے۔ چنانچہ لوگوں کے تحمل کی خاطر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا تاکہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھیں اس پر غور کریں اور اسے حرز جان بنائیں اور اسی کے مطابق ان کے ذہن و فکر کی سطح بلند ہو۔ یہ حکمت سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۶ میں بیان کی گئی ہے:

﴿وَقَرَأْنَا لَهُمْ تِلْكَ آيَاتِنَا فَتَوَسَّعَتْ لَهُمْ قُلُوبُهُمْ وَفَتَرَأَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفَعِينَ لَكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾

”اور ہم نے قرآن کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کر دیا تاکہ آپ تھوڑا تھوڑا کر کے

اور وقفہ وقفہ سے لوگوں کو سناتے رہیں اور ہم نے اسے بتدریج اتارا۔“
 اس حکمت کو سمجھنے کے لیے بارش کی مثال ملاحظہ کیجئے۔ بارش اگر ایک دم بہت
 موسلا دھار ہو تو اس میں وہ برکات نہیں ہوتیں جو تھوڑی تھوڑی اور تدریجاً ہونے والی
 بارش میں ہوتی ہیں۔ بارش اگر تدریجاً ہو تو زمین کے اندر جذب ہوتی چلی جائے گی
 لیکن اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ بہتا چلا جائے گا۔ یہی
 معاملہ قرآن مجید کے انزال و تنزیل کا ہے۔ اس میں لوگوں کی مصلحت ہے کہ قرآن ان
 کے فہم میں ان کے باطن میں ان کی شخصیتوں میں تدریجاً سرایت کرتا چلا جائے۔
 سرایت کے حوالے سے مجھے پھر علامہ اقبال کا شعر یاد آیا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جان چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

”(یہ قرآن) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک
 انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے
 لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!“

تو جب یہ قرآن کسی کے اندر اس طرح اتر جاتا ہے جیسے بارش کا پانی زمین میں جذب
 ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے سرایت کرنے کے لیے اس
 کا تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کیا جانا ہی حکمت پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم
 بات سورۃ الفرقان میں کہی گئی ہے اس لیے کہ وہاں کفار مکہ بالخصوص سرداران قریش کا
 باقاعدہ ایک اعتراض نقل ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۖ كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً ۖ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿١٠﴾﴾

”مکرین کہتے ہیں: اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا
 گیا؟ — ہاں ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو ہم اچھی طرح آپ کے ذہن
 نشین کرتے ہیں اور اس کو ہم نے بغرض ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔“

اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ) جب کبھی وہ آپ کے سامنے کوئی نزالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے، اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے آپ کو دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔“

اعتراض یہ تھا کہ یہ پورا قرآن یک دم، یک بارگی کیوں نہیں نازل کر دیا گیا؟ اس اعتراض میں جو وزن تھا، پہلے اس کو سمجھ لیجئے۔ انہوں نے جو بات کی درحقیقت اس سے مراد یہ تھی کہ جیسے ہمارا ایک شاعر دفعۃً پورا دیوان لوگوں کو فراہم نہیں کر دیتا، بلکہ وہ ایک غزل کہتا ہے، قصیدہ کہتا ہے، پھر مزید محنت کرتا ہے، پھر کچھ اور طبع آزمائی کرتا ہے، پھر کچھ اور کہتا ہے، اس طرح تدریجاً دیوان بن جاتا ہے، اسی طریقے سے محمد (ﷺ) کر رہے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو پورے کا پورا یک دم نازل ہو سکتا تھا۔ یہ تو درحقیقت انسان کی کیفیت ہے کہ پوری کتاب دفعۃً produce نہیں کر دیتا۔ پورا دیوان تو کسی شاعر نے ایک دن کے اندر نہیں کہا، بلکہ اسے وقت لگتا ہے، وہ مسلسل محنت کرتا ہے، کچھ تکلف بھی کرتا ہے، کبھی آمد بھی ہو جاتی ہے، لیکن وہ کلام دیوان کی شکل میں تدریجاً مدون ہوتا ہے۔ تو یہ تو اسی طرح کی چیز ہے۔ ﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ ”کیوں نہیں یہ قرآن اس پر یک دم نازل ہو گیا؟“

اب اس کا جواب دیا گیا: ﴿كَذَلِكَ لِنُنَبِّئَ بِهِ قَوْمًا ذٰلِكَ﴾ ”یہ اس لیے کیا ہے تاکہ اے نبی ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو شہیت (جماؤ) عطا کریں۔“ یعنی وہ بات جو عام انسانوں کی مصلحت میں ہے وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی مصلحت پر مبنی ہے کہ آپ کے لیے بھی شاید قرآن مجید کا ایک بارگی تحمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاٰیْتَهُ خٰشِعًا مُّتَصِدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ ”اگر ہم پورے کے پورے قرآن کو دفعۃً کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔“ (نوٹ کیجئے کہ یہاں لفظ ”انزال“ آیا ہے)۔ معلوم ہوا کہ قلب محمدی کو جماؤ اور ٹھہراؤ عطا کرنے کے لیے اسے بتدریج نازل کیا گیا ہے۔

﴿وَرَكَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً﴾ اور ہم نے اس کو بغرض ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔
 ”رتل“ چھوٹے پیمانے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں۔

اگلی آیت میں جو ارشاد ہوا اس کے دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اے نبی! جو اعتراض بھی یہ ہم پر کریں گے ہم اس کا بہترین جواب آپ کو عطا کر دیں گے۔ لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ ایک مسلسل کشاکش ہے جو آپ کے اور مشرکین عرب کے درمیان چل رہی ہے۔ آج وہ ایک بات کہتے ہیں اگر اسی وقت اس کا جواب دیا جائے تو وہ درحقیقت آپ کی دعوت کے لیے موزوں ہے۔ اگر یہ سارے کا سارا کلام الہی ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتا تو حالات کے ساتھ اس کی مطابقت اور ان کی طرف سے پیش ہونے والے اعتراضات کا بروقت جواب نہ ہوتا اور اس کے اندر جو اثر انداز ہونے کی کیفیت ہے وہ حاصل نہ ہوتی۔ اس تدریج میں اپنی جگہ موزونیت ہے اور اس کی اپنی تاثیر ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کو تدریجاً نازل کیا گیا۔

قرآن کریم کا زمانہ نزول اور ارض نزول

رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے نزول کے ضمن میں اب دو چھوٹی چھوٹی چیزیں اور نوٹ کر لیجیے۔ یہ صرف معلومات کے ضمن میں ہیں۔ اس کا زمانہ نزول کیا ہے؟ ہم جس حساب (سن عیسوی) سے بات کرنے کے عادی ہیں اسی حساب سے ہمارے ذہن کا صغریٰ کبریٰ بنا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم کا زمانہ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک ۲۲ برس پر مشتمل ہے۔ قمری حساب سے یہ ۲۳ برس بنیں گے۔ ۴۰ عام الفیل سے شروع کریں تو ۱۲ سال قبل ہجرت اور ۱۱ ہجری سال مل کر ۲۳ سال قمری بنیں گے جن کے دوران یہ قرآن بطرز تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ صحیح احادیث میں یہ شہادت موجود ہے کہ پہلے سورۃ العلق کی پانچ آیات نازل ہوئیں پھر تین سال کا وقفہ آیا۔ سورۃ العلق کی یہ پانچ آیات بھی چونکہ قرآن مجید کا حصہ ہیں لہذا صحیح قول یہی ہے کہ قرآن حکیم کا زمانہ نزول ۲۳ قمری یا ۲۲ شمسی سال ہے۔

اب یہ کہ نزول کی جگہ کون سی ہے؟ اس ضمن میں صرف ایک لفظ نوٹ کر لیجیے کہ

تقریباً پورے کا پورا قرآن ”حجاز“ میں نازل ہوا۔ اس لیے کہ آغاز وحی کے بعد حضور اکرم ﷺ کا کوئی سفر حجاز سے باہر ثابت نہیں ہے۔ آغاز وحی سے قبل آپ نے متعدد سفر کیے ہیں۔ آپ شام کا سفر کرتے تھے یقیناً یمن بھی آپ جاتے ہوں گے۔ اس لیے کہ الفاظ قرآنی ”رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ“ کی رو سے قریش کے سالانہ دو سفر ہوتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں شمال کی طرف جاتے تھے اس لیے کہ فلسطین کا علاقہ نسبتاً ٹھنڈا ہے اور سردیوں کے موسم میں وہ جنوب کی طرف (یمن) جاتے تھے اس لیے کہ وہ گرم علاقہ ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے بھی تجارتی سفر کیے ہیں۔ بعض محققین نے تو یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ آپ نے اُس زمانے میں کوئی بحری سفر بھی کیا اور گلف کو عبور کر کے مکران کے ساحل پر کسی جگہ آپ تشریف لائے (واللہ اعلم!)۔ یہ بات میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک لیکچر میں سنی تھی جو انہوں نے حیدرآباد (سندھ) میں دیا تھا، لیکن بعد میں اس پر جرح ہوئی کہ یہ بہت ہی کمزور قول ہے اور اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں ہے۔ البتہ ”الخمر“ جہاں آج آباد ہے وہاں پر تو ہر سال ایک بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا اور حضور ﷺ کا وہاں تک آنا ثابت ہے۔ بہر حال آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ آغاز وحی کے بعد دس سال تک تو مکہ مکرمہ میں رہے اس کے بعد طائف کا سفر کیا ہے۔ پھر آس پاس ”عکاظ“ کا میلہ لگتا تھا اور منڈیاں لگتی تھیں ان میں آپ نے سفر کیے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی ہے۔ اس کے بعد سب جنگیں حجاز کے علاقے ہی میں ہوئیں سوائے غزوہ تبوک کے۔ لیکن تبوک بھی اصل میں حجاز ہی کا شمالی سرا ہے۔ اس اعتبار سے حجاز ہی کا علاقہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ تاہم دو آیتیں اس اعتبار سے مستثنیٰ قرار دی جاسکتی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر نازل ہوئیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو تین تحفے عطا کیے ان میں نماز کی فرضیت اور دو آیات قرآنی شامل ہیں۔ یہ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات ہیں جو عرش کے دو فرزانے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں عطا ہوئے۔ تو یہ

دو آیتیں مستثنیٰ ہیں کہ یہ زمین پر نازل نہیں ہوئیں بلکہ آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ پر دی گئیں اور خود آپ ساتویں آسمان پر تھے جبکہ باقی پورا قرآن آسمان سے زمین پر نازل ہوا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے حجاز کا علاقہ مہبط وحی ہے۔

(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے بارے میں تین بنیادی اور اعتقادی چیزیں ہیں: اول یہ اللہ کا کلام ہے۔ دوم یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ سوم یہ من و عن نکل کا کل محفوظ ہے۔ اس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ کوئی بیشی ہوئی ہے۔ نہ کمی ہو سکتی ہے نہ بیشی ہو سکتی ہے۔ نہ کوئی تحریف ہوئی ہے نہ کوئی تبدیلی۔ یہ گویا ہمارے عقیدے کا جزو لاینفک ہے۔ اس میں کچھ اشتباہ اہل تشیع نے پیدا کیا ہے لیکن ان کی بات بھی میں کچھ یقین کے ساتھ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ قول بھی سامنے آتا ہے کہ ”ہم اس قرآن کو محفوظ مانتے ہیں“۔ البتہ عوام میں جو چیزیں مشہور ہیں کہ قرآن سے فلاں آیات نکال دی گئیں فلاں سورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح اور شان میں تھی وہ اس میں سے نکال دی گئی وغیرہ ان کے بارے میں میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان میں سے عوام کا لانا عام کی باتیں ہیں یا ان کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن یہ کہ بہر حال اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ قرآن حکیم محفوظ ہے اور نکل کا کل من و عن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کے لیے خود قرآن مجید سے جو گواہی ملتی ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سورۃ القیامت میں آئی ہے۔ فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُجْعَلَ بِهِ ۖ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ازراہ شفقت فرمایا کہ ”آپ اس قرآن کو یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کرادینا اور پڑھوادینا ہمارے ذمہ ہے“۔ آپ شفقت نہ جھیلیں یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اسے آپ کے سینہ مبارک کے اندر جمع کر دیں گے اور اس کی ترتیب قائم کر دیں گے اس کو پڑھوادیں گے۔ جس ترتیب سے یہ نازل ہو رہا ہے اس کی زیادہ فکر نہ کیجئے۔ اصل ترتیب

جس میں اس کا مرتب کیا جانا ہمارے پیش نظر ہے جو ترتیب لوح محفوظ کی ہے اسی ترتیب سے ہم پڑھوادیں گے۔ ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتٍ﴾ پھر اگر آپ کو کسی چیز میں ابہام محسوس ہو اور وضاحت کی ضرورت ہو تو اس کی توضیح اور تدوین بھی ہمارے ذمہ ہے۔

یہ ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ اگر ان آیات کو کوئی شخص قرآن مجید کی آیات مانتا ہے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید پورے کا پورا جمع ہے اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا۔ صراحت کے ساتھ یہ بات سورۃ الحج کی آیت ۹ میں مذکور ہے۔ فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ ”ہم نے ہی اس ”الذکر“ کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“ یہ گویا ہمیشہ ہمیش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے خوبصورت شعر میں بیان کیا ہے: ع

حرف او را ریب نے تبدیل نے

آیہ اش شرمندہ تاویل نے

”اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ رد و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔“

اس شعر میں تین اعتبارات سے نفی کی گئی ہے: (۱) قرآن کے حروف میں یعنی اس کے متن میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ من و عن محفوظ ہے۔ (۲) اس میں کہیں کوئی تحریف ہوئی ہو کہیں تبدیلی کی گئی ہو قطعاً ایسا نہیں۔ (۳) کیا اس کی آیات کی الٹ سلسلے تاویل بھی کی جاسکتی ہے؟ نہیں! یہ آخری بات بظاہر بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ تاویل کے اعتبار سے قرآن مجید کے معنی میں لوگوں نے تحریف کی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر کہیں معنوی تحریف کی کوشش بھی ہوئی ہے تو وہ قطعاً درجہ استناد کو نہیں پہنچ سکی اسے کبھی بھی استقلال اور دوام حاصل نہیں ہو سکا۔ قرآن نے خود اس کو رد کر دیا۔ جس طرح دودھ میں سے کبھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے ایسی تاویلات بھی امت کی تاریخ کے دوران کہیں بھی جڑ نہیں پکڑ سکی ہیں

اور اسی طرح نکال دی گئی ہیں۔ اس بات کی سند بھی قرآن میں موجود ہے۔ سورہ حم
 السجدہ کی آیت ۴۲ میں ہے: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ
 مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ ”باطل اس (قرآن) پر حملہ آور نہیں ہو سکتا نہ سامنے سے نہ
 پیچھے سے یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔“

یہ بات سرے سے خارج از امکان ہے کہ اس قرآن میں کوئی تحریف ہو جائے
 اس کا کوئی حصہ نکال دیا جائے اس میں کوئی غیر قرآن شامل کر دیا جائے۔ سورہ
 الحائدہ کی یہ آیات ملاحظہ کیجئے جہاں گویا اس امکان کی نفی میں مبالغے کا انداز ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ﴿۱﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿۲﴾ ثُمَّ لَقَطْنَا
 مِنْهُ الْوَكُيْنَ ﴿۳﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَمِيزٌ ﴿۴﴾﴾

”کوئی اور تو اس میں اضافہ کیا کرے گا (اگر یہ (ہمارے نبی محمد ﷺ) خود بھی
 (بفرض محال) اپنی طرف سے کچھ گھڑ کر اس میں شامل کر دیں تو ہم انہیں دانے
 ہاتھ سے پکڑیں گے اور ان کی شرگ کاٹ دیں گے۔ پھر تم میں سے کوئی
 (بڑے سے بڑا محافظ ان کا حامی و مددگار) نہیں ہو گا کہ جو انہیں ہماری پکڑ
 سے بچائے۔“

یہاں تو محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی اس شدت کے ساتھ نفی کر دی گئی۔ کفار و مشرکین
 کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ آپ اس قرآن میں کچھ نرمی اور چلک دکھائیں یہ تو
 بہت rigid ہے بہت uncompromising ہے بہر حال دنیا میں معاملات
 ”کچھ لو کچھ دو“ (give and take) سے طے ہوتے ہیں لہذا کچھ آپ نرم پڑیں
 کچھ ہم نرم پڑتے ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَكُفُوا لَوْ تَلَّحْنُ فَيُتَّحِنُونَ ﴿۱﴾﴾
 (اقلم) ”وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے۔“
 اور سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَإِذَا تَلَّيْ عَلَيْهِمْ ابْتِغَاءَ تَبَرٍّ لِقَالِ الَّذِينَ لَا يُرْجُونَ لِقَاءَ نَارٍ يُفْرَانِ
 غَيْرِ هَذَا أَوْ يَبُلُّهُ قَلٌّ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَلِّغَهُ مِنْ تَلْقَائِي نَفْسِي ۚ إِنَّ اللَّهَ

إِلَّا مَا يُؤْتِيهِ الْإِلَهَ ۚ اتَّقُوا إِنَّمَا تَتَخَفُونَ إِنَّمَا أَخَافُ أَنَّ عَصَيْتُمْ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٠﴾

”جب انہیں ہماری آیات پینات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کیجئے۔ (اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے خیال اور ارادے سے اس کے اندر کچھ تبدیلی کر سکوں۔ میں تو خود پابند ہوں اس کا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔“

یہ ہے قرآن مجید کی شان کہ یہ لفظاً، معنیاً، متناکلی طور پر محفوظ ہے۔ ۰۰

چند متفرق مباحث

قرآن مجید کی زبان

اب آئیے اگلی بحث کی طرف کہ قرآن مجید کی زبان کیا ہے اور اس زبان کی شان کیا ہے۔ یہ بات بھی قرآن مجید نے بہت نگر اور اعادہ کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ قرآن عربی زمین میں ہے، یعنی شہ صاف، سلیس، کھلی اور واضح عربی میں ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اس نے جن حروف و اصوات کا جامہ پہنا، وہ حروف و اصوات لوح محفوظ میں ہیں۔ اس کے بعد وہ کلام الہی، قولی جبرائیل علیہ السلام اور قولی محمد مصطفیٰ بن کر نازل ہوا اور لوگوں کے سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں ارشاد ہوا:

﴿حَمْدٌ لِلَّهِ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝﴾
 ”حم۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی! ہم نے اسے قرآن عربی بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔“

قرآن کی مخاطب اول قوم حجاز میں آباد تھی۔ اس سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں بنایا۔ اس نے اولاً حروف و اصوات کا جامہ پہنا ہے پھر تمہاری زبان عربی کا جامہ پہن کر تمہارے سامنے نازل کیا گیا ہے تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔ یہی بات سورۃ یوسف کے شروع میں کہی گئی ہے:

﴿الرَّاٰ ط تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝﴾

”ال۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا جامہ عاصف صاف بیان کرتی ہے۔“

ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم سمجھ سکو۔“
سورۃ الشعراء میں فرمایا:

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾

”صاف صاف عربی زبان میں (نازل کیا گیا)۔“

سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾

”ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے تاکہ وہ سچ کر چلیں۔“

اس میں کہیں کچی نہیں، کہیں کوئی اچھڑ نہیں اس کی زبان بہت سلیس، شستہ اور بالکل واضح زبان ہے۔ اس میں کہیں پہیلیاں بھجوانے کا انداز نہیں ہے۔

اب نوٹ کیجئے کہ قرآن کی عربی کون سی عربی ہے؟ اس لئے کہ عربی زبان ایک ہے مگر اس کے dialects اور اس کی بولیاں بے شمار ہیں۔ خود جزیرہ نمائے عرب میں متعدد بولیاں تھیں، تلفظ اور لہجے مختلف تھے۔ بعض الفاظ کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے اور دوسرے علاقے کے لوگ ان الفاظ کو جانتے ہی نہیں تھے۔ آج بھی کہنے کو تو مصر، لیبیا، الجزائر، موریتانیہ اور حجاز کی زبان عربی ہے، لیکن جو ان کے ہاں فصیح عربی کہلاتی ہے وہ تو ایک ہی ہے۔ وہ درحقیقت ایک اس لئے ہے کہ قرآن مجید نے اسے دوام عطا کیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا عربی زبان پر عظیم احسان ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں دوسری کوئی زبان بھی ایسی نہیں ہے جو چودہ سو برس سے ایک ہی شان اور ایک ہی کیفیت کے ساتھ باقی ہو۔ اردو زبان ہی کو دیکھئے۔ ۱۰۰ اور ۲۰۰ برس پرانی اردو آج ہمارے لئے ناقابل فہم ہے۔ دکن کی اردو ہمیں سمجھ میں نہیں آسکتی اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کا معاملہ ہے۔ ایک وہ فارسی تھی جو عربوں کی آمد اور اسلام کے ظہور کے وقت تھی۔ عربوں کے ہاتھوں ایران فتح ہوا تو رفتہ رفتہ اس فارسی کا رنگ بدلتا گیا۔ اب اس کو پھر بدلا گیا ہے اور اس میں سے عربی الفاظ نکال کر اس کے لہجے بھی بدل دیئے گئے ہیں۔ ایک فارسی وہ ہے جو افغانستان میں بولی جاتی ہے وہ

ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ اس لئے کہ جو فارسی یہاں پڑھائی جاتی تھی وہ یہی فارسی تھی۔ آج جو فارسی ایران میں پڑھائی جا رہی ہے وہ بہت مختلف ہے اپنے لہجے میں بھی اور اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی۔ لیکن عربی ”فصح زبان“ ایک ہے۔ یہ اصل میں حجاز کے بدوؤں کی زبان تھی۔ پورا قرآن حکیم حجاز میں نازل ہوا۔ حجاز میں بادیہ نشین تھے۔ عربوں کا کہنا تھا کہ خالص زبان بادیہ نشینوں کی ہے، شہر والوں کی نہیں۔ جبکہ مکہ شہر تھا اور وہاں باہر سے بھی لوگ آتے رہتے تھے۔ قافلے آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، ٹھہر رہے ہیں۔ جہاں اس طرح کی آمد و رفت ہو وہاں زبان خالص نہیں رہتی اور اس میں غیر زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر مستعمل ہو جاتے ہیں اور بول چال میں آ جاتے ہیں۔ خاص اسی وجہ سے مکہ کے شرفاء اپنے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد بادیہ نشینوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ایک تو دودھ پلانے کا معاملہ تھا۔ دوسرا یہ کہ ان کی زبان صاف رہے، خالص عربی زبان رہے اور وہ ہر ملاوٹ سے پاک رہے۔ تو قرآن مجید حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان میں نازل ہوا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید میں کچھ الفاظ دوسرے قبائل اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کے بھی آئے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ غیر عربی الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں جو معرب ہو گئے ہیں۔ ابراہیم، اسمعیل، اسرائیل، اسحاق، یہ تمام نام درحقیقت عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ لفظ ”ایل“ عبرانی زبان میں اللہ کے لئے آتا ہے اور یہ لفظ ہمارے ہاں قرآن مجید کے ذریعے آیا ہے۔ اسی طریقے سے ”سجیل“ کا لفظ فارسی سے آیا ہے۔ صحرا میں کہیں بارش کے نتیجے میں ہلکی سی پھوار پڑی ہو تو بارش کے قطروں کے ساتھ ریت کے چھوٹے چھوٹے دانے بن جاتے ہیں اور پھر تیز دھوپ پڑنے پر وہ ایسے پک جاتے ہیں جیسے بھنے میں اینٹوں کو پکا دیا گیا ہو۔ یہ کنکر ”جیل“ کہلاتے ہیں جو ”سنگ گل“ کا معرب ہے۔ باقی اکثر و بیشتر قرآن مجید کی زبان جس میں یہ نازل ہوا، وہ حجاز کے علاقے کے بادیہ نشینوں کی عربی ہے، جس میں فصاحت و بلاغت نقطہ عروج پر ہے اور اس کا لوہا مانا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک صوتی آہنگ ہے۔ اس کا ایک ”ملکوتی غنا“ (Divine Music) ہے اس کی ایک عذوبت اور مٹھاس ہے۔ یہ دونوں چیزیں عرب میں پورے طور پر تسلیم کی گئی ہیں اور لوگوں پر سب سے زیادہ مرعوبیت قرآن حکیم کی فصاحت، بلاغت اور عذوبت ہی سے طاری ہوئی۔ ان کی اپنی زبان میں ہونے کے اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ قرآن کے بہترین ناقد بھی وہی ہو سکتے تھے۔ واضح رہے کہ ادب میں ”تنقید“ دونوں پہلوؤں کو محیط ہوتی ہے۔ کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اسے جانچنا، پرکھنا۔ اس میں کوئی خامی ہو تو اس کو نمایاں کرنا اور اگر کوئی محاسن ہوں تو ان کو سمجھنا اور بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس کی فصاحت و بلاغت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان آج بھی مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں اور بولیوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایک علاقے کی عامی (colloquial) عربی دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ خود نزول قرآن کے زمانے میں نجد کے لوگوں کی زبان حجاز کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے کہ نجد سے کچھ لوگ آئے اور وہ حضور ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے جو بڑی مشکل سے سمجھ میں آ رہی تھی اور لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ آج بھی نجد کے لوگ جو گفتگو کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ عربی سے واقفیت ہونے کے باوجود ان کی عربی ہماری سمجھ میں نہیں آتی ان کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہے۔ قرآن حکیم کی زبان حجاز کے بادیہ نشینوں کی ہے۔ لہذا اگر تحقیق و تدبر قرآن کا حق ادا کرنا ہو تو جاہلیت کی شاعری پڑھنا ضروری ہے۔ ائمہ لغت نے ایک ایک لفظ کی تحقیق کر کے اور بڑی گہرائیوں میں اتر کر جاہلی شاعری کے حوالے سے جتنے بھی استشہاد ہو سکتے تھے ان کو کھنگال کر قرآن میں مستعمل الفاظ کے مادوں کے مفہوم معین کر دیئے ہیں۔ ایک عام قاری کو جو قرآن سے تذکر کرنا چاہے صرف ہدایت حاصل کرنا چاہے اس ٹھیکر میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تدبر قرآن کے لئے جب تحقیق کی جاتی ہے تو جب تک کسی

ایک لفظ کی اصل پوری طرح معلوم نہ کی جائے اور اس کے بال کی کھال نہ اتاری جائے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے شعر جاہلی کی زبان کو سمجھنا تدبر قرآن کے لئے یقیناً ضروری ہے۔

قرآن کے اسماء و صفات

اگلی بحث قرآن حکیم کے اسماء و صفات کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”الاتقان فی علوم القرآن“ میں قرآن حکیم کے اسماء و صفات قرآن حکیم ہی سے لے کر پچپن (۵۵) ناموں کی فہرست مرتب کی ہے۔ میں نے جب اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کامل نہیں ہے، مثلاً لفظ ”برہان“ ان کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ درحقیقت قرآن مجید کی صفات اس کی شانوں اور اس کی تاثیر کے لئے مختلف الفاظ کو جمع کیا جائے تو ۵۵ ہی نہیں اس سے زیادہ الفاظ بن جائیں گے، لیکن میں نے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ ہیں جو مفرد کی حیثیت سے اور معرف کی شکل میں قرآن مجید میں قرآن کے لئے وارد ہوئے ہیں جبکہ کچھ صفات ہیں جو موصوف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ مثلاً ”قرآن مجید“ میں ”مجید“ قرآن کا نام نہیں ہے، درحقیقت صفت ہے۔ اسی طرح ”القرآن المجید“ میں اگرچہ ”الف لام“ کے ساتھ ”المجید“ آتا ہے، لیکن یہ چونکہ موصوف کے ساتھ مل کر آیا ہے لہذا یہ بھی صفت ہے۔

قرآن مجید کے لئے جو الفاظ بطور اسم آئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جن کے ساتھ لام تعریف لگا ہوا ہے۔ قرآن کے لئے اہم ترین نام جو اس کا امتیازی اور اختصاصی (The exclusive) نام ہے ”القرآن“ ہے۔ (میں بعد میں اس کی وضاحت کروں گا)۔ اس کے بعد کثرت سے استعمال ہونے والا نام ”الکتاب“ ہے۔ قرآن کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والا اہم ترین نام ”الذکر“ ہے۔ قرآن مجید کی افادیت کے لئے سب سے زیادہ جامع نام ”الہدیٰ“ ہے۔ قرآن مجید کی نوعیت اور حیثیت کے اعتبار سے اہم ترین نام ”النور“ ہے۔ قرآن مجید کی ایک انتہائی اہم

شان جو ایک لفظ کے طور پر آئی ہے ”الفرقان“ ہے۔ یعنی (حق و باطل میں) فرق کر دینے والی شے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دینے والی شے۔ قرآن کا ایک نام ”الوحی“ بھی آیا ہے: ﴿قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ﴾ (الانبیاء: ۴۵)۔ اسی طرح ”کلام اللہ“ کا لفظ بھی خود قرآن میں آیا ہے: ﴿حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ﴾ (التوبة: ۶) چونکہ یہاں کلام مضاف واقع ہوا ہے لہذا یہ بھی معرفہ بن گیا۔ میرے نزدیک جنہیں ہم قرآن کے نام قرار دیں وہ تو یہی بنتے ہیں۔ اگرچہ جیسا کہ میں نے عرض کیا جو لفظ بھی قرآن کے لئے صفت کے طور پر یا اس کی شان کو بیان کرنے کے لئے قرآن میں آ گیا ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کو فہرست میں شامل کر کے ۵۵ نام گنوائے ہیں، لیکن یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔

قرآن کریم کی مختلف شانوں اور صفات کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں: (۱) کَرِيمٌ ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ﴾ (الواقعة) (۲) الْحَكِيمُ ﴿يَسِّسَ ۝ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ﴾ (یس) (۳) الْعَظِيمُ: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ (الحجر) (۴) مَجِيدٌ اور الْمَجِيدُ: ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ﴾ (البروج) اور ﴿ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ﴾ (ق) (۵) الْمُبِينُ: ﴿لَحْمٌ ۝ وَالكِتَابِ الْمُبِينِ﴾ (الزخرف) (۶) رَحْمَةٌ ﴿هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ (یونس) (۷) عَلِيٌّ: ﴿وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيَّ حَكِيمٌ﴾ (الزخرف) (۸) بَصِيرٌ: ﴿قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (الانعام: ۱۰۳) (۹) بُشْرًا وَنُبْرًا: ﴿نَمُ السَّجْدَةِ: ۴﴾ [اگرچہ یہ الفاظ انبیاء کے لئے آتے ہیں لیکن یہاں خود قرآن کے لئے بھی آئے ہیں۔ قرآن اپنی ذات میں فی نفسہ بشر بھی ہے، نذیر بھی ہے] (۱۱) بُشْرَىٰ ﴿وَبُشْرَىٰ لِّلْمُسْلِمِينَ﴾ (النحل: ۸۹، ۱۰۲) (۱۲) عَزِيزٌ: ﴿وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ﴾ (لحم السجدة) (۱۳) بَلَاغٌ ﴿هَذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراہیم: ۵۲) (۱۴) بَيِّنٌ ﴿هَذَا بَيِّنٌ لِّلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۳۸) (۱۵) مَوْعِظَةٌ ﴿مَوْعِظَةٌ لِّلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۳۸) (۱۶) شِفَاءٌ ﴿قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ﴾ (یونس: ۵۷) (۱۷) أَحْسَنُ

الْقَصَصِ: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (یوسف: ۳) (۱۸) أَحْسَنُ الْحَدِيثِ (۱۹) مُتَشَابِهٌ (۲۰) مَثَانِي: ﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِي﴾ (الزمر: ۲۳) (۲۱) مُبَارَكٌ: ﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ﴾ (ص: ۲۹) (۲۲) مُصَدِّقٌ (۲۳) مُهَيِّمٌ: ﴿مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ﴾ (المائدة: ۴۸) (۲۴) قِيمٌ: ﴿قِيمًا لِيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا لِمَنْ لَدُنْهُ﴾ (الکہف: ۲) یہ مختلف الفاظ ہیں جو قرآن حکیم کی مختلف شانوں کے لئے آئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے نانوں (۹۹) نام ہیں، جو اس کی مختلف شانوں کو ظاہر کرتے ہیں، اسی طرح حضور ﷺ کے ناموں کی فہرست بھی آپ نے پڑھی ہوگی۔ آپ ﷺ کی مختلف شانیں ہیں، اس کے اعتبار سے آپ بشیر بھی ہیں، نذیر بھی ہیں، ہادی بھی ہیں، معلم بھی ہیں۔ قرآن مجید کے بھی مختلف اسماء و صفات ہیں۔

لفظ ”قرآن“ کی لغوی بحث:

قرآن مجید کے ناموں میں سب سے اہم نام ”القرآن“ ہے، جس کے لئے میں نے لفظ exclusive استعمال کیا تھا کہ یہ کسی اور کتاب کے لئے استعمال نہیں ہوا، ورنہ تورات کتاب بھی ہے، ہدایت بھی تھی، اور اس کے لئے لفظ نور بھی آیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ﴾ (المائدة: ۴۴) ”ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت بھی ہے اور نور بھی“۔ خود قرآن مجید ہدایت بھی ہے، نور بھی ہے، رحمت بھی ہے۔ تو بقید تمام اوصاف تو مشترک ہیں، لیکن القرآن کے لفظ کا اطلاق کتب سماویہ میں سے کسی اور کتاب پر نہیں ہوتا۔ یہ امتیازی، اختصاصی اور استثنائی نام صرف قرآن مجید کے لئے ہے۔ اسی لئے ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم علم ہے، اور اسم جامد ہے، اسم مشتق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام ”اللہ“ کے بارے میں بھی ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم ذات ہے، اسم علم ہے، اسم جامد ہے، مشتق نہیں ہے، یہ کسی اور مادے سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ جبکہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ بھی صفت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفاتی نام ہیں۔ جیسے ”علیم“ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ”العلیم“ نام ہے، رحیم صفت ہے اور

”الوحیم“ نام ہے اسی طرح الہ پر ”ال“ داخل ہوا تو ”الالہ“ بن گیا اور دو لام مدغم ہونے سے یہ ”اللہ“ بن گیا۔ یہ دوسری رائے ہے۔ جو معاملہ لفظ اللہ کے بارے میں اختلافی ہے بعینہ وہی اختلاف لفظ قرآن کے بارے میں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم جامد اور اسم علم ہے اس کا کوئی اور مادہ نہیں ہے جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ اسم مشتق ہے۔ لیکن پھر اس کے مادے کی تعیین میں اختلاف ہے۔

ایک رائے کے مطابق اس کا مادہ ”قرن“ ہے یعنی قرآن میں جو ”ن“ ہے وہ بھی حرف اصلی ہے۔ دوسری رائے کے مطابق اس کا مادہ ”ق رء“ ہے۔ یہ گویا مہموز ہے۔ میں یہ باتیں اہل علم کی دلچسپی کے لئے عرض کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے اس کا مادہ ”قرن“ مانا ہے ان کی بھی دورائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ جیسے عرب کہتے ہیں ”قَرْنَ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ“ (کوئی شے کسی دوسرے کے ساتھ شامل کر دی گئی) تو اس سے قرآن بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات اللہ تعالیٰ کا کلام جو وقتاً فوقتاً نازل ہوا اس کو جب جمع کر دیا گیا تو وہ ”قرآن“ بن گیا۔ امام اشعری بھی اس رائے کے قائل ہیں۔ جبکہ ایک رائے امام فراء کی ہے جو لغت کے بہت بڑے امام ہیں کہ یہ قرینہ اور قرآن سے بنا ہے۔ قرآن کچھ چیزوں کے آثار ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات چونکہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں جیسا کہ سورۃ الزمر میں قرآن مجید کی یہ صفت وارد ہوئی ہے ”كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَّثَانِيًّا“۔ اس اعتبار سے آپس میں یہ آیات قرناء ہیں۔ چنانچہ قرینہ سے قرآن بن گیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مادہ ق رء ہے وہ قرآن کو مصدر مانتے ہیں۔ قَرَأَ يَقْرَأُ قَرَأًا وَقِرَاءَةً وَقُرْآنًا۔ یہ اگرچہ مصدر کا معروف وزن نہیں ہے لیکن اس کی مثالیں عربی میں موجود ہیں۔ جیسے رَجَحَ سے رُجْحَانٌ اور عَفَوَ سے عُفْرَانٌ۔ ان کے مادہ میں ”ن“ شامل نہیں ہے۔ تو جیسے عُفْرَانٌ اور رُجْحَانٌ مصدر ہیں ایسے ہی قَرَأَ سے مصدر قرآن ہے یعنی پڑھنا۔ اور مصدر بسا اوقات مفعول کا مفہوم دیتا ہے۔ تو قرآن کا مفہوم ہوگا پڑھی جانے والی شے پڑھی گئی شے۔ ”قَرَأَ“ میں جمع کرنے کا مفہوم بھی

ہے۔ عرب کہتے ہیں: قَرَأْتُ الْعَمَاءَ فِي الْحَوْضِ ”میں نے حوض کے اندر پانی جمع کر لیا۔“ اسی سے قریہ بنا ہے، یعنی ایسی جگہ جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔ گویا قرآن کا مطلب ہے اللہ کا کلام جہاں جمع کر دیا گیا۔ تمام آیات جب جمع کر لی گئیں تو یہ قرآن بن گیا۔ جیسے قریہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ آباد ہو جائیں، مل جل کر رہ رہے ہوں۔ تو جمع کرنے کا مفہوم قَرَاءَ میں بھی ہے اور قرآن میں بھی ہے۔ یہ دونوں مادے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ بہر حال یہ اس لفظ کی لغوی بحث ہے۔

قرآن کا اسلوبِ کلام

اب میں اگلی بحث پر آ رہا ہوں کہ اس کا اسلوب کلام کیا ہے! قرآن مجید نے شد و مد کے ساتھ جس بات کی نفی کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعر نہیں ہے۔ ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ﴾ (نہس: 69) ”ہم نے اپنے اس رسول کو شعر سکھایا ہی نہیں نہ ان کے یہ شایانِ شان ہے۔“ شعراء کے بارے میں سورۃ الشعراء میں آیا ہے:

﴿وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۗ أَلَمْ تَرَوْهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهيمُونَ ۗ وَاللَّهُمَّ يَفُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۗ﴾

”اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں گھومتے رہتے ہیں (ہر میدان میں سرگرداں رہتے ہیں) اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔“

اگلی آیت میں ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۗ﴾ کے الفاظ کے ساتھ استثناء بھی آیا ہے اور استثناء قاعدہ کلیہ کی توثیق کرتا ہے (Exception proves the rule)۔ چنانچہ قرآن مجید کے اعتبار سے شعر گوئی کوئی اچھی شے نہیں، کوئی ایسی محمود صفت نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو عطا فرماتا۔ بلکہ حضور اکرم ﷺ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ نے بھی کوئی شعر پڑھتے بھی تھے تو غلطی ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ پر سے اللہ تعالیٰ شاعری کی تہمت ہٹانا چاہتا تھا لہذا آپ کے اندر شاعری کا

وصف ہی پیدا نہیں کیا گیا۔ سیرت کا ایک دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شعر پڑھا اور اس میں غلطی ہوئی۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور عرض کی: "أَشْهَدُ أَنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ" "میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں"۔ اس لئے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ﴾۔ تو واقعاً آپ کو شعر سے یعنی شعر کے وزن اور اس کی بحر وغیرہ سے مناسبت نہیں تھی۔ باقی جہاں تک شعر کے مفہوم کا اور اعلیٰ مضامین کا تعلق ہے تو خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ: ((إِنَّ مِنَ الْبَيِّنَاتِ لَلسُّحْرَ وَإِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لِحِكْمَةً)) یعنی بہت سے بیان بہت سے خطبے اور تقریریں جادو اثر ہوتے ہیں اور بہت سے اشعار کے اندر حکمت کے خزانے ہوتے ہیں۔ بعض شعراء کے اشعار حضور ﷺ نے خود پڑھے بھی ہیں اور ان کی تحسین فرمائی ہے، لیکن قرآن بہر حال شعر نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ قدیم زمانے کی شاعری جس میں بحر وزن اور ردیف و قافیہ کی پابندیاں سختی کے ساتھ ہوتی تھیں، اس کے اعتبار سے یقیناً قرآن شعر نہیں ہے، لیکن ایک شاعری جس کا رواج عصر حاضر میں ہوا ہے اور اس کے لئے غالباً قرآن ہی کے اسلوب کو چرایا گیا ہے، جسے آپ "آزاد نظم" (Blank Verse) کہتے ہیں، اس کے اندر جو صفات اور خصوصیات آج کل ہوتی ہیں ان کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک ردھم (Rythm) بھی ہوتا ہے، اس میں فواصل بھی ہیں، قوافی کی طرز پر صوتی آہنگ بھی ہے، لیکن وہ جو معروف شاعری تھی اس کے اعتبار سے قرآن بڑی تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ قرآن شعر نہیں ہے۔

قرآن کے اسلوب کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ عام معانی میں قرآن کتاب بھی نہیں ہے۔ میں یہاں اقبال کا مصرعہ quote کر رہا ہوں، اگرچہ اس کے وہ معانی نہیں، اس کتابے نیست چیزے دیگر است!

آج ہمارا کتاب کا تصور یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہوتے ہیں۔ آپ کسی

کتاب یا تصنیف میں ایک موضوع کو ایک باب (Chapter) کی شکل دیتے ہیں۔ ایک باب میں ایک بات مکمل ہو جانی چاہئے۔ اگلے باب میں بات آگے چلے گی، کوئی پچھلی بات نہیں دہرائی جائے گی۔ تیسرے باب میں بات اور آگے چلے گی۔ پھر ایک کتاب مضمون کے اعتبار سے ایک وحدت بنے گی اور اس کے اندر موضوعات اور عنوانات کے حوالے سے ابواب (Chapters) تقسیم ہو جائیں گے۔ گویا ہمارے ہاں معروف معنی میں کتاب کا اطلاق جس چیز پر کیا جاتا ہے اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ البتہ یہ ”الکتاب“ ہے بمعنی لکھی ہوئی شے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب قرار دیا ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ کثرت سے یہی لفظ ”کتاب“ ہی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لفظ ساڑھے تین سو (۳۵۰) جگہ آیا ہے۔ قرآن اور قرآناً تقریباً ۷۰ مقامات پر آیا ہے۔ لیکن ”قرآن“ exclusive آیا ہے جبکہ کتاب کا لفظ توراہ انجیل، علم خداوندی اور تقدیر کے لئے بھی آیا ہے اور قرآن مجید کے حصوں اور احکام کے لئے بھی آیا ہے۔ بہر حال کتاب اس معنی میں تو ہے۔ معاذ اللہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کتاب نہیں ہے، لیکن جس معنی میں ہم لفظ کتاب بولتے ہیں اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ یہ مجموعہ مقالات (Collection of Essays) بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر مقالہ اپنی جگہ پر خود مکمل شے ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ تو پھر یہ ہے کیا؟ پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔ عرب میں دو ہی چیزیں زیادہ معروف تھیں، خطابت یا شاعری۔ شعراء ان کے ہاں بڑے محبوب تھے۔ شاعری کا ان کو بڑا ذوق تھا اور وہ شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے ہاں قصیدہ گوئی کے مقابلے ہوتے تھے۔ پھر ہر سال جو سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا تھا اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر سب شاعر اس کے سامنے باقاعدہ سجدہ کرتے تھے۔ پھر اس کا قصیدہ بیت اللہ پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہی قصائد ”سبعة معلقة“ کے نام سے معروف ہیں۔ چنانچہ عرب یا تو

شعروں سے واقف تھے یا خطبوں سے۔ تو قرآن مجید اُس دور کی دوسب سے زیادہ معروف اصناف (شاعری اور خطبہ) میں خطبے کے اسلوب پر ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم مجموعہ خطبات الہیہ (A Collection of Divine Orations) ہے جس میں ہر سورت ایک خطبے کی مانند ہے۔

خطبے کے اعتبار سے چند باتیں نوٹ کر لیں۔ خطبے میں مخاطب اور خطیب کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہوتا ہے۔ مخاطب کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں ان کی فکر کیا ہے ان کی سوچ کیا ہے ان کے عقائد کیا ہیں ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ ان کا حوالہ دیئے بغیر اپنی گفتگو کے اندر ان پر تنقید بھی کرے گا ان کی تصحیح بھی کرے گا، لیکن کوئی تمہیدی کلمات نہیں ہوں گے کہ اب میں تمہاری فلاں غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں میں اب تمہارے اس خیال کی نفی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انداز نہیں ہوگا بلکہ وہ روانی کے ساتھ آگے چلے گا۔ مخاطب اور مخاطب کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں اور خاص طور پر مخاطبین کے فہم ان کی سمجھ ان کے عقائد ان کے نظریات سے خطیب واقف ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خطبے کی شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تخیل خطاب ہوتی ہے اور بغیر وارنگ کے ہوتی ہے۔ بسا اوقات غائب کو حاضر فرض کر کے اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خطیب مسجد میں خطبہ دے رہا ہے اور وہ مخاطب کر رہا ہے صدر مملکت کو حالانکہ وہ وہاں موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں بسا اوقات ان سے صیغہ غائب میں گفتگو شروع ہو جائے گی اور یہ بھی بلاغت کا انداز ہے۔ کبھی وہ ایک طرف بات کر رہا ہے، کبھی دوسری طرف کر رہا ہے، کبھی کسی غائب سے بات کر رہا ہے اور خطابت کا وہی انداز ہوگا اگرچہ وہ غائب وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کو تخیل خطاب کہتے ہیں۔ قرآن مجید پر غور کرنے کے ضمن میں اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر خطاب کا رخ معین ہو کہ یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے مخاطب کون ہے تو اس بات کا اصل مفہوم اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے ورنہ اگر مخاطب کا تعین نہ ہو تو بہت سے بڑے

بڑے مغالطے جنم لے سکتے ہیں۔

خطبے اور مقالے میں ایک واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ مقالے میں عام طور پر صرف عقل سے اپیل کی جاتی ہے۔ اس میں منطق اور عقلی دلائل ہوتے ہیں جبکہ خطبے میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی اپیل ہوتی ہے۔ گویا کہ انسان کے اندر جہاں تک کربات کی جاتی ہے۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے اندر جھانکو۔ ﴿وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ﴾ (الذّٰرئٰت) ”اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیوں ہیں) تو کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟“ ﴿إِنَّمَا إِلَهُ الْكَافِرِينَ﴾ (ابراہیم: ۱۰) ”(ذرا غور کرو) کیا اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو جو زمین و آسمان کا بنانے والا ہے؟“ یہ انداز بہر حال کسی تحریر یا مقالے میں نہیں ہو گا یہ خطبے کا انداز ہے۔

ایک اور بات جو خطبے کے اعتبار سے اس کے خصائص میں سے ہے وہ یہ کہ ایک مؤثر خطبے کے شروع میں بہت جامع گفتگو ہوتی ہے۔ کامیاب خطبہ وہی ہو گا جس کا آغاز ایسا ہو کہ مقرر اور خطیب اپنے مخاطبین اور سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے۔ اور پھر اگرچہ خطبے کے دوران مضمون دائیں بائیں پھیلے گا ادھر جائے گا ادھر جائے گا، لیکن آخر میں آ کر وہ پھر کسی مضمون کے اوپر مرکوز ہو جائے گا۔ یہ اگر نہیں ہے تو گویا کہ وقت ضائع ہو گیا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے ہیں۔ خاص طور پر مجلس احرار نے بڑے عوامی خطیب پیدا کئے جن میں سے عطاء اللہ شاہ بخاری بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی تقریر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گفتگو چار چار گھنٹے پانچ پانچ گھنٹے چل رہی ہے۔ اس میں کبھی مشرق کی، کبھی مغرب کی، کبھی شمال کی اور کبھی جنوب کی بات آ جاتی۔ کبھی ہنسانے کا اور کبھی رلانے کا انداز ہوتا، کہیں لطیفہ گوئی بھی ہو جاتی۔ لیکن اول و آخر بات بالکل واضح ہوتی۔ خوب گھما پھرا کر بھی مخاطب کو کسی ایک بات پر لے آنا کہ اٹھے تو کوئی ایک بات، کوئی ایک پیغام لے کر اٹھے، کوئی ایک جذبہ اس کے اندر جاگ چکا ہو ایک پیغام اس تک پہنچ چکا ہو یہ خطبے کے اوصاف ہیں۔

آپ کو معلوم ہے خواہ غزل ہو یا قصیدہ، شاعری میں مطلع اور مقطع دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مطلع جاندار ہے تو آپ پوری غزل پڑھیں گے اور اگر مطلع ہی پھسپھسا ہے تو آگے آپ کیا پڑھیں گے! اسی طرح مقطع بھی جاندار ہونا چاہئے۔ اسی لئے مقطع اور مطلع کے الفاظ علیحدہ سے وضع کئے گئے ہیں۔ خطبات کے اندر بھی ابتدا اور اختتام پر نہایت جامع اور اہم مضمون ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدا اور اختتام بھی نہایت جامع مضامین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات کی فضیلت پر بہت سی احادیث ملتی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات اسی طرح سورۃ آل عمران کی شروع کی آیات اور پھر اختتامی آیات نہایت جامع ہیں۔ یہ انداز اکثر و بیشتر سورتوں میں ملے گا۔ یہ ہے اصل میں بالعموم قرآن مجید کا اسلوب جو ظاہر بات ہے شاعری کا نہیں ہے۔ عام معانی میں وہ کتاب نہیں، مجموعہ مقالات نہیں۔ اس کا اسلوب اگر ہے تو وہ خطبے سے ملتا ہے۔ یہ گویا خطبات الہیہ ہیں جن کا مجموعہ ہے قرآن!

قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم

آیات اور سورتوں کی تقسیم

بہت سی چیزوں سے مل کر کوئی شے مرکب بنتی ہے۔ قرآن کلام مرکب ہے۔ اس کی تقسیم سورتوں اور آیات میں ہے۔ پھر اس میں احزاب اور گروپ ہیں۔ عام تصور کتاب تو یہ ہے کہ اس کے ابواب ہوتے ہیں، لیکن قرآن حکیم پر ان اصطلاحات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم نے اپنی اصطلاحات خود وضع کی ہیں۔ ان اصطلاحات کی دنیا میں موجود کسی بھی کتاب کی اصطلاحات سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ جاحظ نے ایک بڑا خوبصورت عنوان قائم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرب اس سے تو واقف تھے کہ ان کے بڑے بڑے شعراء کے دیوان ہوتے تھے۔ سارا کلام کتابی شکل میں جمع ہو گیا تو وہ دیوان کہلایا۔ لہذا کسی بھی درجے میں اگر مثال اور تشبیہ سے سمجھنا چاہیں تو دیوان کے مقابلے میں لفظ قرآن ہے۔ پھر دیوان بہت سے قصائد کا مجموعہ ہوتا تھا۔ ہمارے ہاں بھی کسی شاعر کا دیوان ہوگا تو اس میں قصائد ہوں گے، غزلیں ہوں گی، نظمیں ہوں گی۔ قرآن حکیم میں اس سطح پر جو لفظ ہے وہ سورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام سورتوں پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی نثر کی کتاب ہے تو وہ جملوں پر مشتمل ہوگی اور اگر نظم کی ہے تو وہ اشعار پر مشتمل ہوگی۔ اس کی جگہ قرآن مجید کی اصطلاح آیت ہے۔ شاعری میں اشعار کے خاتمے پر ردیف کے ساتھ ساتھ ایک لفظ قافیہ کہلاتا ہے اور غزل کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید پر بھی ہم عام طور پر اس لفظ کا اطلاق کر دیتے ہیں، اس لئے کہ قرآن مجید کی آیات میں بھی آخری الفاظ کے اندر صوتی آہنگ ہے۔ یہاں انہیں فواصل کہا جاتا ہے، قافیہ کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا کہ کسی بھی درجے

میں شعر کے ساتھ کوئی مشابہت نہ پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید کا سب سے چھوٹا یونٹ آیت ہے۔ یعنی قرآن مجید کی ابتدائی اکائی کے لئے لفظ آیت اخذ کیا گیا ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ قرآنی آیت گویا اللہ کے علم و حکمت کی نشانی ہے۔ آیت کا لفظ قرآن مجید میں بہت سے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً آیات آفاقی اور آیات انفسی۔ اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کے علم اور اس کی حکمت کی گواہی دے رہی ہے۔ گویا ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔ پھر کچھ نشانیاں ہمارے اندر ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝﴾ (الذّٰرِیٰت) ”اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے۔ اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟“ مزید فرمایا: ﴿مَسْرِيهِمْ إِلَيْنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۝﴾ (خمس السجدات: ۵۳) ”عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔“ انگریزی میں آیت کے لیے ہم لفظ verse بول دیتے ہیں، مگر verse تو شعر کو کہتے ہیں جبکہ قرآن کی آیات نہ تو شعر ہیں نہ مصرعے ہیں نہ جملے ہیں۔ پس بعینہ لفظ آیت ہی کو عام کرنا چاہیے۔ بہر حال کچھ آیات آفاقی ہیں، یعنی اللہ کی نشانیاں، کچھ آیات انفسی ہیں، وہ بھی اللہ کی نشانیاں ہیں اور آیات قرآنیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور علم کامل کی نشانیاں ہیں۔ یہ لفظ قرآن کی اکائی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جان لینا چاہیے کہ آیات کا تعین کسی گرامر بیان یا نحو کے اصول پر نہیں ہے، اس میں کوئی اجتہاد داخل نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے ایک اصطلاح ”توقیفی“ استعمال ہوتی ہے، یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیات بہت طویل بھی ہیں۔ ایک آیت آیۃ الکرسی ہے جس میں عمل دس جملے ہیں، لیکن بعض آیات حروف مقطعات پر بھی مشتمل ہیں۔ ﴿حٰم﴾ ایک آیت ہے حالانکہ اس کا

کوئی مفہوم معلوم نہیں ہے، عام زبان کے اعتبار سے اس کے معانی معین نہیں کیے جا سکتے۔ یہ تو حروف تہجی ہیں۔ اس کو مرکب کلام بھی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں۔ ﴿حَمّ ۝ عَسَق ۝﴾ ان کو جمع نہیں کر سکتے، یہ توڑ توڑ کر علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے۔ اسی طرح ”آلَم“ کو ”آلَم“ نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی آیت ہے۔ اس ضمن میں ایک بات یاد رکھئے کہ جہاں حروف مقطعات میں سے ایک ایک حرف آیا ہے جیسے ﴿ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ ۝﴾، ﴿ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝﴾، ﴿ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ ۝﴾ یہاں ایک حرف پر آیت نہیں بنی، لیکن دو دو حروف پر آیتیں بنی ہیں۔ ”حَمّ“ قرآن میں سات جگہ آیا ہے اور یہ مکمل آیت ہے۔ ”آلَم“ آیت ہے۔ البتہ ”آلَم“ تین حروف ہیں اور وہ آیت نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد کسی اصول، قاعدے یا اجتہاد پر نہیں ہے، بلکہ یہ امور کلیتہً توقیفی ہیں کہ حضور ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئے ہیں۔ البتہ پھر حضور ﷺ سے چونکہ مختلف روایات ہیں، اس لئے اس پہلو سے کہیں کہیں فرق واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آیات قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے۔ اس پر اتفاق ہے کہ آیات کی تعداد چھ ہزار سے زائد ہے، لیکن بعض کے نزدیک کم و بیش ۶۲۱۶، بعض کے نزدیک ۶۲۳۶ اور بعض کے نزدیک ۶۶۶۶ ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ بعض سورتوں کے اندر آیات کے تعین میں بھی فرق ہے۔ لیکن یہ سب کسی کا اپنا اجتہاد نہیں ہے، بلکہ سب کے سب اعداد و شمار حضور ﷺ سے نقل ہونے کی بنیاد پر ہیں۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ آیت بسم اللہ قرآن حکیم میں ۱۱۳ مرتبہ سورتوں کے شروع میں آتی ہے (کیونکہ سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے اور ان میں سے صرف ایک سورت سورۃ التوبہ کے شروع میں بسم اللہ نہیں آتی۔) اگر اس کو ہر مرتبہ شمار کیا جائے تو ۱۱۳ تعداد بڑھ جائے گی، ہر مرتبہ شمار نہ کیا جائے تو ۱۱۳ تعداد کم ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے آیات قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے، بلکہ اس میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ حروف مقطعات پر بھی آیت ہے، ہر کہات ناقصہ پر بھی آیت ہے، جیسے ﴿وَالْعَصْرِ ۝﴾

کہیں آیت مکمل جملہ بھی ہے اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں دس دس جملے ہیں۔
 قرآن حکیم کی آیتیں جمع ہوتی ہیں تو سورتیں وجود میں آتی ہیں۔ سورت کا لفظ
 ”سور“ سے ماخوذ ہے اور یہ لفظ سورۃ الحمد میں فیصل کے معنی میں آیا ہے۔ پچھلے
 زمانے میں ہر شہر کے باہر گرداگرد ایک فیصل ہوتی تھی جو شہر کا احاطہ کر لیتی تھی، شہر کی
 حفاظت کا کام بھی دیتی تھی اور حد بندی بھی کرتی تھی۔ آیات کو جب جمع کیا گیا تو اس
 سے جو فصیلیں وجود میں آئیں وہ سورتیں ہیں۔ فصل علیحدہ کرنے والی شے کو کہتے ہیں۔
 تو گویا ایک سورۃ دوسری سورۃ سے علیحدہ ہو رہی ہے۔ فیصل علیحدگی کی بنیاد ہے۔ فیصل
 کے لئے ”سور“ کا لفظ مستعمل ہے پھر اس سے سورت بنا ہے۔ البتہ یہ سورتیں
 ”ابواب“ نہیں ہیں بلکہ جس طرح آیت کے لئے لفظ verse مناسب نہیں اسی
 طرح سورت کے لئے لفظ ”باب“ یا chapter درست نہیں۔

اب جان لیجئے کہ جیسے آیات کا معاملہ ہے ایسے ہی سورتوں کا بھی ہے۔ چنانچہ
 سورتیں بہت چھوٹی بھی ہیں۔ قرآن مجید کی تین سورتیں صرف تین تین آیات پر مشتمل
 ہیں: سورۃ النصر، سورۃ النصر اور سورۃ الکوثر۔ جبکہ تین سورتیں ۲۰۰ سے زائد آیات پر
 مشتمل ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں۔ (سورۃ البقرۃ کی آیات کی
 تعداد کے اعتبار سے رائے میں فرق ہے۔) سب سے زیادہ آیات سورۃ البقرۃ میں
 ہیں۔ پھر سورۃ الشعراء میں ۲۲۷ اور سورۃ الاعراف میں ۲۰۶ آیات ہیں۔ محققین و علماء
 کا اس پر اجماع ہے کہ آیات کی طرح سورتوں کا تعین بھی حضور ﷺ نے خود فرمایا۔
 اگرچہ ایک ضعیف سا قول ملتا ہے کہ شاید یہ کام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی اجتہاد سے کیا ہو
 مگر یہ عقار قول نہیں ہے، ضعیف ہے۔ اجماع اسی پر ہے کہ آجوں کی تعین بھی تو قینی اور
 سورتوں کی تعین بھی تو قینی ہے۔

قرآن حکیم کی سات منازل

دور صحابہؓ میں ہمیں ایک تقسیم اور ملتی ہے اور وہ ہے سات منزلوں کی شکل میں
 سورتوں کی گردچنگ۔ انہیں ازراب بھی کہتے ہیں۔ ”حزب“ کا لفظ احادیث میں ملتا

ہے، لیکن وہ ایک ہی معنی میں نہیں ہوتا۔ یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا کہ ہر شخص اپنے لیے تلاوت کی ایک مقدار معین کر لیتا تھا کہ میں اتنی مقدار روزانہ پڑھوں گا۔ یہ گویا کہ اس کا اپنا حزب ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهِ مِنَ اللَّيْلِ، أَوْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ، فَقَرَأَهُ مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الظُّهْرِ، كُتِبَ لَهُ كَأَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ اللَّيْلِ))

(الخرجه الجماعة الا البخاری)

”جو شخص نیند (یا بیماری) کی وجہ سے رات کو (تہجد میں) اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے، پھر وہ فجر اور ظہر کے درمیان اس کی تلاوت کر لے تو اس کے لیے اتنا ہی ثواب لکھا جائے گا گویا اس نے اسے رات کے دوران پڑھا ہے۔“ (یہ حدیث بخاری کے سوا دیگر ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔)

یعنی جو شخص کسی وجہ سے کسی رات اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے، جتنا بھی نصاب اس نے معین کیا ہو، کسی بیماری کی وجہ سے یا نیند کا غلبہ ہو جائے، تو اسے چاہیے کہ اپنی اس قراءت یا تلاوت کو وہ دن کے وقت ضرور پورا کر لے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر کا معمول تھا کہ ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت ختم کر لیتے تھے۔ لہذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے سات حصے ایسے ہو جائیں کہ ایک حصہ روزانہ تلاوت کریں تو ہر ہفتے قرآن مجید کا دور مکمل ہو جائے۔ اس لیے سورتوں کے سات مجموعے یا گروپ بنا دیے گئے۔ ان گروپوں کے لیے آج کل ہمارے ہاں جو لفظ مستعمل ہے وہ ”منزل“ ہے، لیکن احادیث و روایات میں حزب کا لفظ آتا ہے۔

احزاب یا منازل کی اس تقسیم میں بڑی خوبصورتی ہے۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ یہ ساتوں حصے بالکل مساوی کیے جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ظاہر بات ہے کہ سورتیں ٹوٹ جاتیں، ان کی فصیلیں ختم ہو جاتیں۔ چنانچہ ہر حزب میں پوری پوری سورتیں جمع کی گئیں۔ اس طرح احزاب یا منزلوں کی مقداریں مختلف ہو گئیں۔ چنانچہ کچھ حزب چھوٹے ہیں کچھ بڑے ہیں، لیکن ان کے اندر سورتوں کی فصیلیں نہیں ٹوٹیں، یہ ان کا حسن

ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شے بھی شاید اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ منزلوں کی تعین بھی توقیفی ہے، لیکن منزلوں کی اس تقسیم میں گنتی کے اعتبار سے جو حسن پیدا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی کا ایک مظہر ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو الگ رکھ دیا جائے کہ یہ تو قرآن حکیم کا مقدمہ یا دیباچہ ہے تو اس کے بعد پہلا حزب یا منزل تین سورتوں (البقرۃ، آل عمران، النساء) پر مشتمل ہے۔ دوسری منزل پانچ سورتوں پر تیسری منزل سات سورتوں پر چوتھی منزل نو سورتوں پر پانچویں منزل گیارہ سورتوں پر اور چھٹی منزل تیرہ سورتوں پر مشتمل ہے، جبکہ ساتویں منزل (حزب مفصل) جو کہ آخری منزل ہے اس میں ۶۵ سورتیں ہیں۔ آخر میں سورتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ یاد رہے کہ ۶۵ بھی ۱۳ کا multiple بنتا ہے (۶۵ = ۱۳ × ۵)۔ سورتوں کی تعداد جیسا کہ ذکر ہو چکا ۱۱۴ ہے۔ یہ تعداد متفق علیہ ہے، جس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

آج کل جو قرآن مجید حکومت سعودی عرب کے زیر اہتمام بہت بڑی تعداد میں بڑی خوبصورتی اور نفاست سے شائع ہوتا ہے اس میں حزب کا لفظ بالکل ایک نئے معنی میں آیا ہے۔ انہوں نے ہر پارے کو دو حزب میں تقسیم کر لیا ہے، گویا نصف پارے کی بجائے لفظ حزب ہے۔ پھر وہ حزب بھی چار حصوں میں منقسم ہے: رُبُع الحزب، نصف الحزب اور پھر ثلثۃ ارباع الحزب۔ اس طرح انہوں نے ہر پارے کے آٹھ حصے بنا لیے ہیں۔ یہ لفظ حزب کا بالکل نیا استعمال ہے۔ اس کی کیا سند اور دلیل ہے اور یہ کہاں سے ماخوذ ہے، یہ میرے علم میں نہیں ہے۔

انسانی کلام حروف و اصوات سے مرتب ہوتا ہے اور ہر زبان میں حروف ہجائیہ ہوتے ہیں۔ پھر حروف مل کر کلمات بناتے ہیں۔ کلمات سے کلام وجود میں آتا ہے، خواہ وہ کلام منظوم ہو یا نثر ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کی ترکیب ہے۔ حروف سے مل کر کلمات بنے، کلمات نے آیات کی شکل اختیار کی، آیات جمع ہوئیں سورتوں کی شکل میں اور سورتیں جمع ہو گئیں منزلوں کی شکل میں۔

رکوعوں اور پاروں کی تقسیم

سورتوں کی پہلی تقسیم رکوعوں میں ہے۔ یہ تقسیم دو صحابہؓ اور دو رنبویؓ میں موجود نہیں تھی۔ یہ تقسیمیں زمانہ مابعد کی پیداوار ہیں۔ رکوعوں کی تقسیم بڑی سورتوں میں کی گئی۔ ۳۵ سورتیں ایسی ہیں جو ایک ہی رکوع پر مشتمل ہیں، یعنی وہ اتنی چھوٹی ہیں کہ انہیں ایک رکعت میں آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے، لیکن بقیہ سورتیں طویل ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں اور اس کے ۴۰ رکوع ہیں۔ حضور ﷺ سے منقول ہے کہ آپؐ نے ایک رات ان تین سورتوں (البقرۃ آل عمران النساء) کی منزل ایک رکعت میں مکمل کی ہے۔ لیکن یہ تو استثناءات کی بات ہے۔ عام طور پر تلاوت کی وہ مقدار جو ایک رکعت میں آسانی پڑھی جاسکتی ہو ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہے۔ رکوع رکعت سے ہی بنا ہے۔ یہ تقسیم حجاج بن یوسف کے زمانے میں یعنی تابعین کے دور میں ہوئی ہے۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تقسیم بڑی محنت سے معانی پر غور کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ کسی مقام پر ایک مضمون مکمل ہو گیا اور دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے تو وہاں اگر رکوع کر لیا جائے تو بات ٹوٹے گی نہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر ائمہ مساجد پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوتے، عربی زبان سے واقف نہیں ہوتے، لہذا اکثر ایسی تکلیف دہ صورت حال پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسی جگہ پر رکوع کر دیتے ہیں جہاں کلام کا ربط منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر اگلی رکعت میں وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے بات معنوی اعتبار سے بہتر ہی گراں گزرتی ہے۔ رکوعوں کی تقسیم بالعموم بہت عمدہ ہے، لیکن چند ایک مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت یہاں سے ہٹا کر رکوع ماقبل میں شامل کی گئی ہوتی یا رکوع کا نشان اس آیت سے پہلے ہوتا تو معانی اور مفہوم کے اعتبار سے بہتر ہوتا۔ بہر حال اکثر و بیشتر رکوعوں کی تقسیم معنوی اعتبار سے صحیح ہے جو بڑی محنت سے گہرائی میں غور کر کے کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک تقسیم پاروں کی شکل میں ہے۔ یہ تقسیم تو اور بھی بعد کے زمانے

کی ہے اور بڑی بھونڈی تقسیم ہے اس لیے کہ اس میں سورتوں کی فصیلیں توڑ دی گئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا جوش ایمان کم ہوا اور لوگوں نے معمول بنانا چاہا کہ ہر مہینے میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیں تب ان کو ضرورت پیش آئی کہ اس کو تیس حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کسی نے غالباً یہ حرکت کی کہ اس کے پاس جو مصحف موجود تھا اس نے اس کے صفحے گن کر تیس پر تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح جہاں بھی صفحہ کٹ گیا وہیں نشان لگا دیا اور اگلا پارہ شروع ہو گیا۔ اس بھونڈی تقسیم کی مثال دیکھنے کے لیے سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں ہے باقی پوری سورت چودہویں پارے میں ہے۔ ہمارے ہاں جو مصحف ہیں ان میں آپ کو یہی شکل نظر آئے گی۔ سعودی عرب سے جو قرآن مجید بڑی تعداد میں شائع ہو کر پوری دنیا میں پھیلا ہے یہ اب پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسی انداز سے شائع کیا جاتا ہے جس سے کہ ہم مانوس ہیں۔ البتہ اہل عرب کے لیے جو قرآن مجید شائع کیا جاتا ہے اس میں رموز اوقاف اور علامات ضبط بھی مختلف ہیں اور اس میں چودہواں جزء سورۃ الحجر سے شروع کیا جاتا ہے۔ گویا وہ تقسیم جو ہمارے ہاں ہے اس میں انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے، اگرچہ پاروں کی تقسیم باقی رکھی ہے۔ بعض دوسرے عرب ممالک سے جو قرآن مجید شائع ہوتے ہیں۔ ان میں پاروں کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی متفق علیہ چیز نہیں ہے اور زمانہ تابعین میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے یہ اس سے بہت بعد کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((خَيْرُ النَّاسِ قَوْلِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ)) اس حدیث کی رو سے بہترین ادوار تین ہی ہیں۔ دور صحابہ دور تابعین پھر در تبع تابعین۔ ان تین زمانوں کو ہم ”قرون مشہودہ“ لہا بالخیر“ کہتے ہیں۔ باقی اس کے بعد کا معاملہ حجت نہیں ہے اس کی دین کے اندر کوئی مستقل اور دائمی اہمیت نہیں ہے۔

ترتیب نزولی اور ترتیب مصحف کا اختلاف

قرآن حکیم کی ترتیب کے ضمن میں پہلی بات جو بالکل متفق علیہ اور ہر شک و شبہ سے بالا ہے وہ یہ ہے کہ ترتیب نزولی بالکل مختلف ہے اور ترتیب مصحف بالکل مختلف ہے۔ اکثر و بیشتر جو سورتیں ابتدا میں نازل ہوئیں وہ آخر میں درج ہیں اور ہجرت کے بعد جو سورتیں نازل ہوئی ہیں (البقرۃ آل عمران النساء المائدۃ) ان کو شروع میں رکھا گیا ہے۔ تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ترتیب نزولی اور ترتیب مصحف مختلف ہے۔

جہاں تک ترتیب نزولی کا تعلق ہے اس سے ہر طالب علم کو دلچسپی ہوتی ہے جو قرآن مجید پر غور کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ترتیب نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کے معانی اور مفہیم کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ایک خاص پس منظر کے ساتھ سورتیں جڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ ابتدا میں کیا حالات تھے جن میں یہ سورتیں نازل ہوئیں پھر حالات نے کیا پلٹا کھایا تو اگلی سورتیں نازل ہوئیں۔ چنانچہ ترتیب نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کو مرتب کیا جائے تو ایک اعتبار سے وہ سیرت النبی کی کتاب بن جائے گی۔ اس لیے کہ آغاز وحی کے بعد سے لے کر آپ کے انتقال تک وہ زمانہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس پورے زمانے کے ساتھ قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کا جو مجموعی ربط ہے ترتیب نزولی کی مدد سے اسے سمجھنے اور غور و فکر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پس قرآن مجید کے ہر طالب علم کو اس سے دلچسپی ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ انہوں نے ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کو مرتب کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات بہت شد و مد کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ انہوں نے بھی اس کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا اور عوام کی سطح پر یہ مشہور ہے کہ اہل تشیع اسی کو اصل اور مستند قرآن مانتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ مصحف ان کے بارہویں امام کے پاس ہے جو ایک غار میں روپوش ہیں۔ قیامت کے قریب جب وہ ظاہر ہوں گے تب وہ اپنا یہ مصحف یعنی ”اصل

قرآن“ لے کر آئیں گے۔ گویا اہل تشیع یہ قرآن اُس وقت تک کے لیے ہی قبول کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کی طرف یہی بات منسوب ہے، لیکن دور حاضر کے بعض شیعہ علماء اس تصور کے قائل نہیں ہیں۔ ایک شیعہ عالم دین سید ہادی علی نقوی نے بہت ہڈ دمدہ کے ساتھ اس تصور کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ ”ہم اسی قرآن کو مانتے ہیں یہی اصل قرآن ہے اور اسے من وعن محفوظ مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کوئی آیت اس سے خارج نہیں ہوئی اور کوئی شے باہر سے بعد میں اس میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی جو ”ذُفِّین“ یعنی جلد کے دو تئوں کے مابین ہے، یہی حقیقی اور اصلی قرآن ہے۔“

بہر حال اگر حضرت علیؓ کے پاس ایسا کوئی مصحف تھا جسے آپ نے ترتیب نزولی کے مطابق مرتب کیا تھا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ علمی اور تحقیقی اعتبار سے قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے کے لیے قرآن مجید کے بعض انگریزی تراجم میں بھی ترتیب نزولی کے اعتبار سے سورتوں کو مرتب کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (محمد عزة درويزة نے بھی اپنی تفسیر ”التفسیر الحدیث“ میں سورتوں کو نزولی اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔) علمی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اصل حجیت ترتیب مصحف کی ہے۔ یہ ترتیب توفیقی ہے۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ترتیب ہے اور یہی ترتیب لوح محفوظ میں ہے۔ اصل قرآن تو وہی ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِیْمٌ ﴿۱﴾ فِیْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۲﴾﴾ (الواقعة) اور ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِیْدٌ ﴿۱﴾ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲﴾﴾ (البروج) ”الاتقان فی علوم القرآن“ میں جلال الدین سیوطی نے بہت ہی زور اور تاکید کے ساتھ کسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر تمام انسان اور جن مل کر کوشش کر لیں تب بھی ترتیب نزولی پر قرآن کو مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس مکمل معلومات نہیں ہیں۔ بہت سی سورتوں کے اندر بعد میں نازل ہونی والی آیات پہلے آگئی ہیں اور شروع میں نازل ہونی والی بعد میں آئی ہیں۔ اس اعتبار سے ایک ایک آیت کے بارے میں معین کرنا اور اس کی ترتیب کے بارے میں اجماع ناممکن ہے۔ چنانچہ اصل مصحف وہی ہے جو ہمارے پاس ہے اور اس کی ترتیب بھی

توقیفی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہے۔

اس ترتیب مصحف کے اعتبار سے اس دور میں سورتوں کی ایک نئی گروپنگ کی طرف راہنمائی ہوئی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے خاص طور پر اپنی توجہ کو نظم قرآن پر مرکوز کیا، آیات کا باہمی ربط تلاش کیا۔ نیز یہ کہ آیتوں کی وہ کون سی قدر مشترک ہے جس کی بناء پر ان کو سورتوں میں جمع کیا گیا۔ پھر یہ کہ ہر سورۃ کا ایک عمود اور مرکزی مضمون ہے، بظاہر آیات غیر مربوط نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کے مابین ایک منطقی ربط موجود ہے اور ہر آیت اس سورۃ کے عمود کے ساتھ مربوط ہے۔ مزید یہ کہ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ ان چیزوں پر مولانا فراہیؒ نے زیادہ توجہ کی۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اس بات کو مزید آگے بڑھایا ہے۔

اس ضمن میں ایک اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے کہ قرآن مجید کا یہ پہلو اس زمانے میں کیوں سامنے آیا اور اس سے پہلے اس پر غور کیوں نہیں ہو سکا؟ کیا ہمارے اسلاف قرآن مجید پر تدبر کا حق ادا نہیں کرتے تھے؟ اس اشتباہ کو اپنے ذہن میں نہ آنے دیں، اس لیے کہ قرآن مجید کی شان یہ ہے کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ حضور ﷺ کا اپنا قول ہے کہ ”لَا تَنْقِضِي عَجَابِي“۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص دور کے محدثین، محققین، مفسرین قرآن مجید کے علم کا تمام و کمال احاطہ کر چکے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ قرآن مجید پر بھی طعن ہوتا اور خود حضورؐ کے اس قول کی بھی نفی ہوتی۔ یہ تو جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا قرآن مجید کے عجائب اس کی حکمتیں، اس کے علوم و معارف کے نئے نئے خزانے برآمد ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارا طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ مطالعہ قرآن کے بعد ہم یہ محسوس کریں کہ ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کو سیکھا ہے اور بعد میں آنے والے اس میں سے کچھ اور بھی حاصل کریں گے، وہ ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہیں گے، اس میں غور و فکر اور تدبر کرتے رہیں گے اور نئے نئے علوم اور نئے نئے نکات اس میں سے برآمد ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہی زمانہ اس انکشاف کے لیے معین تھا اور یہ بات ہے

کہ حکمت قرآنی کا جو بھی کوئی نیا پہلو دریافت ہو گا وہ کسی انسان ہی کے ذریعے سے ہو گا۔ لہذا اس کے لیے طبیعت کے اندر بعد محسوس نہ کریں۔ بہر حال مولانا فرامیؒ نے نظم قرآن کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ وہ تفسیر قرآن لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہیں سکے، صرف چند سورتوں کی تفاسیر انہوں نے لکھی ہیں۔ ان میں سے بھی بعض نامکمل ہیں۔ وہ ایک مفکر قسم کے انسان تھے، مصنف قسم کے انسان نہیں تھے۔ مفکر انسان مسلسل غور کرتا رہتا ہے اور اس کے سامنے نئے نئے پہلو آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا تصنیف و تالیف کا انداز یہ تھا کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر فائل کھول رکھے تھے۔ جب کوئی نیا خیال آتا تو کاغذ پر لکھ کر متعلقہ فائل میں شامل کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف ان کی وفات کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں، جبکہ ان کے زمانے میں وہ صرف فائلوں کی شکل میں تھیں اور کسی شے کے چھپنے کی نوبت آئی ہی نہیں۔ سوچ و بچار کا تسلسل ان کے آخری لمحے تک جاری رہا۔ ”مقدمہ نظام القرآن“ و ”اقتتال ان کے فکر اور سوچ کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے شاگرد رشید امین احسن اصلاحی صاحب نے بات کو آگے بڑھایا ہے۔ نظم قرآن کے بارے میں ان حضرات کے نتیجہ فکر کے چند نکات ملاحظہ ہوں:

(i) ہر سورت کا ایک عمود ہے، جیسے ایک ہار کی ڈوری ہے اور اس میں موتی پروئے ہوئے ہیں۔ یہ ڈوری دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی، موتی نظر آتے ہیں، لیکن ان کو باندھنے والی شے تو ڈوری ہے جس میں وہ پروئے گئے ہیں۔ اسی طرح ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہے جس کے ساتھ اس کی تمام آیات مربوط ہیں۔

(ii) قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی مضمون کا ایک رخ ایک سورت میں آ جاتا ہے اور اسی کا دوسرا رخ اس جوڑے کے دوسرے حصے میں آ کر مضمون کی تکمیل کر دیتا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔ البتہ جہاں تک اس اصول کے انطباق کا تعلق ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اور جو حضرات میرے دروس میں تسلسل سے شرکت کرتے رہے ہیں

انہیں معلوم ہے کہ مجھے بہت سے مواقع پر اصلاحی صاحب سے اختلاف بھی ہے لیکن اصولاً یہ بات درست ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ تاہم بعض سورتیں منفرد حیثیت کی مالک ہیں ان کا جوڑا اس جگہ پر موجود نہیں ہے۔ اگرچہ میں نے تحقیق کی ہے کہ اکثر و بیشتر ایسی سورتوں کے جوڑے بھی معنا قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ النور تنہا اور منفرد ہے سورۃ الاحزاب بھی منفرد اور تنہا ہے لیکن یہ دونوں آپس میں جوڑا ہیں اور ان میں جوڑا ہونے کی نسبت تمام و کمال موجود ہے۔ اسی طرح سورۃ الفاتحہ منفرد ہے۔ وہ تو اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ واقعاً اس کا تمام و کمال جوڑا بننا ممکن نہیں وہ اپنی جگہ پر قرآن حکیم اور سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي ہے لیکن سورۃ الناس میں غور کریں تو معنا یہ سورت سورۃ الفاتحہ کا جوڑا بنتی ہے۔ اس لیے کہ سورۃ الفاتحہ میں استعانت ہے اور سورۃ الناس میں استعاذہ۔ پھر سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی تین شانیں رَبُّ مَلِكٌ اَلہ ہیں اور یہی تین شانیں سورۃ الناس میں بھی ہیں۔

(iii) تلاوت کے لیے سات منزلوں کے علاوہ قرآن حکیم میں سورتوں کی ایک معنوی گروپنگ بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی سورتوں کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ میں کئی اور مدنی دونوں طرح کی سورتیں شامل ہیں۔ ہر گروپ میں ایک یا ایک سے زیادہ کئی سورتیں اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں ہیں۔ ایک گروپ کی کئی اور مدنی سورتوں میں وہی نسبت ہے جو ایک جوڑے کی دو سورتوں میں ہوتی ہے۔ جیسے ایک مضمون کی تکمیل ایک جوڑے کی سورتوں میں ہوتی ہے یعنی ایک رُخ ایک فرد میں اور دوسرا رُخ دوسرے فرد میں اسی طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون اور عمود ہے جس کا ایک رُخ کئی سورتوں میں اور دوسرا رُخ مدنی سورتوں میں آجاتا ہے۔ اس طرح غور و فکر اور تدبر کے نئے میدان سامنے آ رہے ہیں۔ جو انسان بھی ان کا عمود معین کرنے میں غور و فکر کرے گا وہ کسی نتیجے پر پہنچے گا اگرچہ عمود معین کرنے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑا گروپ پہلا ہے جس میں کئی ٹخردت صرف ایک یعنی سورۃ الفاتحہ جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی

ہیں، یعنی سورۃ البقرۃ، آل عمران، النساء اور المائدۃ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو سورتیں مکی اور دو مدنی ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکی ہیں جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ میں سورۃ یونس سے سورۃ المؤمنون تک چودہ مکی سورتیں ہیں۔ یہ تقریباً سات پارے بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مدنی سورت ہے اور وہ سورۃ النور ہے۔ اس کے بعد چوتھے گروپ میں سورۃ الفرقان سے سورۃ السجدۃ تک مکیات ہیں پھر ایک مدنی سورت سورۃ الاحزاب ہے۔ پانچویں گروپ میں سورۃ سبأ سے سورۃ الاحقاف تک مکیات ہیں پھر تین مدنی سورتیں سورۃ محمد، سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات ہیں۔ اس کے بعد چھٹے گروپ میں پھر سورۃ ق سے سورۃ الواقعة تک سات مکیات ہیں جن کے بعد پھر دس مدنیات ہیں سورۃ المدینہ تا سورۃ التحریم۔ اسی طرح ساتویں گروپ میں بھی پہلے مکی سورتیں ہیں اور آخر میں دو مدنی سورتیں۔ اس طرح یہ سات گروپ بنتے ہیں۔ یہ گروپ مولانا اصلاحی صاحب کے مرتب کردہ ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری گروپ اس اعتبار سے عکسی نسبت رکھتے ہیں کہ پہلے گروپ میں صرف ایک سورت سورۃ الفاتحہ مکی ہے اور سوا چھ پاروں پر مشتمل چار طویل ترین سورتیں مدنی ہیں جبکہ آخری گروپ میں سورۃ الملک سے لے کر پورے دو پارے تقریباً مکیات پر مشتمل ہیں آخر میں صرف دو سورتیں ”معوذتین“ مدنی ہیں۔ یعنی یہاں نسبت بالکل عکسی ہے۔ لیکن دوسرا گروپ بھی متوازن ہے یعنی دو سورتیں مکی دو مدنی۔ اور چھٹا گروپ بھی متوازن ہے کہ اس میں سات سورتیں مکی ہیں (سورۃ ق سے سورۃ الواقعة تک) جبکہ دس سورتیں مدنی ہیں (سورۃ المدینہ سے سورۃ التحریم تک) لیکن حجم کے اعتبار سے تقریباً برابر ہیں۔ یہ بھی غور و فکر اور سوچ بچار کا ایک موضوع ہے اور اس سے بھی قرآن مجید کی حکمت و ہدایت اور اس کے علم کے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتوں کے جوڑے ہونے کا معاملہ قرآن مجید میں بعض جگہوں پر تو بہت ہی نمایاں ہے۔ ”المعوذتین“ آخری دو سورتیں ہیں جو معوذتہ پر مشتمل ہیں: ﴿قُلْ

اعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾۔ اسی طرح الزہراؤ میں ”دونہایت تابناک سورتیں“ سورۃ البقرۃ اور آل عمران ہیں۔ حضور ﷺ نے ان دونوں کو بھی ایک نام دیا جیسے آخری دو سورتوں کو ایک نام دیا۔ اسی طرح سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر میں اور سورۃ النحیٰ اور سورۃ الانشراح میں معنوی ربط ہے۔ سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق میں تو یہ ربط بہت ہی نمایاں ہے۔ دونوں سورتوں کا آغاز بالکل ایک جیسا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ﴾ اور ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾۔ مضمون کے اندر بھی بڑی گہری مناسبت ہے۔ اس کے بعد سورۃ القف اور سورۃ الجمعہ کا جوڑا ہے۔ سورۃ القف سَبَّحَ لِلَّهِ سے اور سورۃ الجمعہ يُسَبِّحُ لِلَّهِ کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہے۔ سورۃ القف کی مرکزی آیت جو رسول اللہ ﷺ کے مقصد بعثت کو معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ ہے جبکہ سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت جو حضور ﷺ کے انقلاب کا اساسی منہاج معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ہے۔ بہر حال سورتوں کا جوڑا ہونا سورتوں کا گروپ کی شکل میں ہونا ان گروپس کا اپنا ایک عمود اور ایک مرکزی مضمون ہونا پھر اس کے دورخ بن جانا جو اس کی کمیات اور مدنیات میں آتے ہیں قرآن مجید کے علم و حکمت کے خزانے کے وہ دروازے ہیں جو اب کھلے ہیں۔ اس طرح کے دروازے ہر دور میں کھلتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کھلتے رہیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید پرتد کر اور تدبر تسلسل کے ساتھ جاری رہنا چاہیے۔

پچھے سات منزلوں اور سات احزاب کا ذکر ہو چکا۔ اب کی اور مدنی سورتوں کے سات گروپس کا بیان ہوا۔ یہ دونوں قسم کے گروپ دو جگہ پر آ کر مل جاتے ہیں۔ پہلی منزل تو سورۃ النساء پر ختم ہو جاتی ہے اور پہلا گروپ سورۃ المائدۃ پر ختم ہوتا ہے۔ سورۃ التوبۃ پر دوسری منزل بھی ختم ہوتی ہے اور دوسرا گروپ بھی ختم ہوتا ہے۔ سورۃ یونس سے تیسری منزل شروع ہوتی ہے اور تیسرا گروپ بھی شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک

مقام اور ہے۔ سورہ ق سے آخری منزل بھی شروع ہو رہی ہے اور اسی سے چھٹا گروپ بھی شروع ہو رہا ہے۔ سورہ ق چھٹے گروپ کی پہلی ہی سورہ ہے۔ یہ چھٹا گروپ سورہ التحریم پر ختم ہو جاتا ہے اور آخری گروپ سورہ الملک سے شروع ہوتا ہے، لیکن جو منزل سورہ ق سے شروع ہوتی ہے وہ سورہ الناس تک ایک ہی ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو معلومات کے درجے میں سامنے رہیں اور ذہن میں موجود رہیں تو انسان جب غور کرتا ہے تو ان کے حوالے سے بعض اوقات حکمت کے بڑے قیمتی موتی ہاتھ لگتے ہیں۔

تدوین قرآن

قرآن مجید کی تدوین کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں مکمل ہو گئی تھی۔ کسی شاعر کا دیوان اس کی غزلوں اور قصائد پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کی بھی تدوین ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک دیوان کی شکل میں ہے اس کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ جمع و تدوین قرآن اپنی جگہ پر بہت اہم موضوع ہے۔ اس کے بارے میں خاص معلومات ہمارے ذہنوں میں ہر وقت متحضر رہنی چاہئیں، کیونکہ عام طور پر اہل تشیع کے حوالے سے ہمارے ہاں جو چیزیں مشہور ہیں (واللہ اعلم وہ حقیقت پر مبنی ہیں یا محض مخالفین کا پراپیگنڈا ہے) ان کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہوئے ہیں اور وہ کافی بڑے حلقے کے اندر پھیلے ہیں۔

ہمارے ہاں جمعے کے خطبے جو مرتب کیے گئے ہیں اور عام خطیب پڑھتے ہیں ان میں بھی ایسے الفاظ آگئے ہیں جو بہت بڑے بڑے مخالفوں کی بنیاد بن گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی دشمن اسلام نے، کسی باطنی نے، کسی غالی قسم کے رافضی نے یہ الفاظ شامل کر دیئے ہوں۔ بظاہر تعریف ہو رہی ہے مگر حقیقت میں تنقیص ہو رہی ہے اور دین کی جڑ کاٹی جا رہی ہے۔ اس کی مثال بھی اسی تدوین کے ذیل میں آئے گی۔

قرآن حکیم کی تدوین تین مراحل میں مکمل ہوئی۔ پہلی تدوین رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہو گئی تھی، لیکن وہ تدوین اس شکل میں تھی کہ سورتیں معین ہو گئیں، سورتوں کی ترتیب معین ہو گئی۔ کتابی شکل میں قرآن مجید حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں موجود نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس مختلف حصوں میں لکھا ہوا قرآن تھا۔ لوگ اونٹ کے شاہنے کی ہڈی (جو کافی چوڑی ہوتی ہے) پر لکھتے تھے یا کوہے کی ہڈی پر لکھا جاتا تھا۔ اونٹ کی

پسلیاں (ribs) بھی بڑی چوڑی ہوتی ہیں یہ بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ کاغذ اس زمانے میں کہاں تھا، کپڑا زیادہ دستیاب تھا، لہذا کپڑے پر بھی لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے پتھروں پر بھی آیات لکھ لیتے تھے۔ یاد رہے کہ قرآن مجید کی اصل حیثیت ”قول“ کی ہے۔ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ (الحاقہ) نہ تو یہ حضور ﷺ کو لکھی ہوئی شکل میں دیا گیا نہ حضور ﷺ نے لکھی ہوئی شکل میں اُمت کو دیا۔ حضور ﷺ کو بھی یہ پڑھایا گیا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی ﴿سُنُّوْكَ فَا لَا تَنْسُوْا﴾ (الاعلیٰ) ”ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں“۔ یہ اذلا قول جبرائیلؑ پھر قول محمد ﷺ بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جبرائیلؑ سے حضور ﷺ نے سنا، حضور سے صحابہؓ نے سنا۔ چنانچہ اصل میں تو قرآن پڑھی جانے والی شے ہے۔ لیکن جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا آپ اسے لکھوا بھی لیتے۔ بعض صحابہ کرام ؓ کتابت وحی کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ اور حضور ﷺ نے اس بات کا حکم بھی دے دیا تھا کہ ﴿لَا تَكْتُبُوْا عَلَیْ غَیْرِ الْقُرْاٰنِ﴾ ”میری طرف سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو“۔

احادیث کو لکھنے سے حضور ﷺ نے منع فرما دیا تھا تا کہ کہیں اللہ اور رسول کا کلام گڈبڈ نہ ہو جائے، صرف قرآن مجید کو ہی لکھنے کا حکم دیا۔ لیکن اصل قرآن اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے سینے میں جمع کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کے سینوں میں جمع کر دیا۔ وہ قول سے قول کی شکل میں گیا ہے، لوگوں نے حضور ﷺ کے وہن مبارک سے سیکھا ہے۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ کے دور میں لکھا ہوا قرآن بھی تھا لیکن کتابی شکل میں جمع شدہ نہیں تھا۔ جمع شدہ شکل میں صرف سینوں میں تھا، حافظ کو یاد تھا۔ انہیں یاد کہ قرآن اس ترتیب کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ روایات کے مطابق ہر رمضان المبارک میں جتنا قرآن اُس وقت تک نازل ہو چکا تھا، حضور ﷺ اور حضرت جبرائیلؑ اس کا دور کرتے تھے، جیسا کہ ہمارے ہاں رمضان کے آنے سے پہلے حافظ دور کرتے ہیں ایک حافظ سنا تا ہے دوسرا سنتا ہے تا

شروع میں سنانے کے لیے تازہ ہو جائے۔ تو رمضان المبارک میں حضور ﷺ اور حضرت جبرائیلؑ مذاکرہ کرتے تھے قرآن مجید کا دور ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی کے آخری رمضان میں آپ نے حضرت جبرائیلؑ سے قرآن مجید کا دو مرتبہ مکمل دور کیا۔ چنانچہ جہاں تک حافظے میں اور سینے میں قرآن کا مدون ہو جانا ہے وہ تو نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے دوران مکمل ہو گیا تھا۔

تدوین قرآن کا دوسرا مرحلہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں آیا جب مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے جنگیں ہوئیں۔ جنگ یمامہ میں تو بہت بڑی تعداد میں صحابہؓ شہید ہوئے۔ یہ بڑی خون ریز جنگ تھی اور اس میں کثیر تعداد میں حافظ قرآن شہید ہو گئے تو تشویش پیدا ہوئی اور یہ خیال آیا کہ اس قرآن کو اب کتابی شکل میں جمع کر لینا چاہیے۔ یہ خیال سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے دل میں آیا۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات حضرت ابوبکرؓ سے کہی تو وہ بڑے متردد ہوئے کہ میں وہ کام کیسے کروں جو حضور ﷺ نے نہیں کیا! لیکن حضرت عمرؓ اصرار کرتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت ابوبکرؓ کو بھی اس پر انشراح صدر ہو گیا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اب تمہاری اس بات کے لیے اللہ نے میرے سینے کو کشادہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری حضرت زید بن ثابتؓ پر ڈالی گئی جو حضور ﷺ کے زمانے میں کاتب وحی تھے۔ آپ ﷺ کے چند خاص صحابہ جو کتابت وحی پر مامور تھے ان میں حضرت زید بن ثابتؓ بہت معروف تھے۔ ان سے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم یہ کام کرو اور ان کے ساتھ کچھ اور صحابہ کی ایک کمیٹی تشکیل دینے دی۔ وہ بھی پہلے بہت متردد رہے۔ ان کی دلیل بھی یہ تھی کہ جو کام حضور ﷺ نے نہیں کیا وہ کیسے کروں! علاوہ ازیں یہ تو پہاڑ جیسی ذمہ داری ہے یہ میں کیسے اٹھاؤں! لیکن جب حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما دونوں کا اصرار ہوا تو ان کا بھی سینہ کھل گیا۔ پھر جن صحابہؓ کے پاس قرآن حکیم کا جو حصہ بھی لکھی ہوئی شکل میں تھا ان سے لیا گیا اور مختلف شہادتوں اور حفاظ کی مدد سے عہد صدیقی میں قرآن پاک کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیا گیا۔ یاد رہے کہ ایک

کتاب کی شکل میں بھی قرآن مجید کی تدوین رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے دو سال کے اندر اندر مکمل ہو گئی۔ حضرت ابوبکر ؓ کا عہد خلافت کل سوا دو برس ہے۔

حضرت ابوبکر ؓ کی مجلس شوریٰ میں یہ مسئلہ بھی زیر غور آیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تو قرآن ایک جلد کے مابین جمع نہیں کیا گیا، لہذا اس کا نام کیا رکھا جائے! ایک تجویز یہ آئی کہ اسے بھی انجیل کا نام دیا جائے۔ ایک رائے یہ دی گئی کہ اس کا نام ”سفر“ ہو، اس لیے کہ سفر کا لفظ توراہ کی کتابوں کے لیے معروف چلا آ رہا تھا، جیسے سفر ایوب ایک کتاب تھی۔ تو سفر کتاب کو کہتے ہیں جس کی جمع ”اسفار“ ہے اور یہ لفظ قرآن میں بھی آیا ہے۔ سفر کا لفظی مطلب ہے روشنی دینے والی۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے تجویز پیش کی کہ اس کا نام ”مصحف“ ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میرا آنا جانا حبشہ ہوتا ہے وہاں کے لوگوں کے پاس ایک کتاب ہے اور وہ اسے مصحف کہتے ہیں۔ اب ”مصحف“ کے لفظ پر اتفاق و اجماع ہو گیا۔ چنانچہ قرآن کے لیے حضرت ابوبکر ؓ کے عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی تجویز پر مصحف نام رکھا گیا اور اس پر لوگوں کا اجماع ہوا۔ تدوین قرآن کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت کے ضمن میں ایک معاملہ چلا آ رہا تھا، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا تھا۔ عربوں کی زبان تو ایک تھی لیکن بولیاں مختلف تھیں، الفاظ کے لہجے مختلف تھے۔ تو سب لوگوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے لہجے کے اندر قرآن پڑھ لیا کریں تاکہ سہولت رہے، ورنہ بڑی مشقت کی ضرورت تھی کہ سب لوگ اپنے لہجے بدلیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلابی جدوجہد کا tempo اتنا تیز تھا کہ ان کاموں کے لیے زیادہ فرصت نہیں تھی کہ اس کے لیے باقاعدہ ادارے قائم ہوں، مختلف جگہوں سے لوگ آئیں اور اپنا لہجہ بدل کر قریش کے لہجے کے مطابق کریں، حجازی لہجہ اختیار کریں۔ چنانچہ اجازت دی گئی تھی کہ اپنے اپنے لہجوں میں پڑھ لیں۔ مختلف لہجوں میں پڑھنے کے ساتھ کچھ لفظی فرق بھی آنے لگے۔ حضرت عثمان ؓ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہ آ گئی کہ مختلف لہجوں میں لفظی فرق

کے ساتھ بھی قرآن پڑھا جانے لگا۔ کوئی شخص قرآن پڑھ رہا ہوتا دوسرا کہتا کہ یہ غلط
 پڑھا ہے یہ یوں نہیں ہے، جیسے میں پڑھ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ اس پر اس جذباتی قوم
 کے اندر تلواریں نکل آتی تھیں۔ اندیشہ ہوا کہ اگر اس طرح سے یہ بات پھیل گئی تو قرآن
 کا کوئی ایک ٹیکسٹ متفق علیہ نہیں رہے گا۔ امت کو جمع کرنے والی شے تو یہ قرآن ہی ہے
 اس میں لفظی فرق کے نتیجے میں دائمی افتراق و انتشار پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت
 عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مشورے سے طے کیا کہ قرآن کا ایک ٹیکسٹ تیار کیا جائے۔ اس
 ٹیکسٹ کے لیے لفظ ”رسم“ ہے۔ رسم الخط کا لفظ ہم استعمال کرتے ہیں۔ ”اب ت“
 حروف ہیں، لیکن عربی میں لکھے جائیں گے تو ان کا رسم الخط کچھ اور ہے، اردو میں لکھے
 جائیں گے تو ان کی شکل اور ہے۔ حضرت عثمان نے ایک رسم الخط اور ایک ٹیکسٹ پر
 قرآن جمع کیا۔ انہوں نے بھی ایک کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی کو یہ حکم دے دیا گیا کہ تمام
 بچوں کو رد کر کے قریش کے لہجہ پر قرآن کا ٹیکسٹ تیار کیا جائے جو متفق علیہ ٹیکسٹ ہوگا۔
 چنانچہ اس کمیٹی نے بڑی محنت و شاقہ سے اس کام کی تکمیل کی۔ اس طرح قرآن کا رسم الخط
 معین ہو گیا اور ایک متفق علیہ ٹیکسٹ وجود میں آ گیا۔ رسم عثمانی کے مطابق سورۃ الفاتحہ
 میں ”مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ لکھا جائے گا، لکھنے کی شکل یہ نہیں ہوگی: ”مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ“۔
 ایک قراءت میں چونکہ مَلِكِ بھی ہے تو ”مَلِكِ“ کو ”مَلِكِ“ بھی پڑھا جاسکتا ہے اور
 ”مَلِكِ“ بھی۔ تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مشورے
 سے سرانجام دیا کہ قرآن کا ایک رسم الخط معین ہو گیا اور مصاحفِ عثمان تیار ہو گئے۔ بعض
 روایات کے مطابق اس کی چار نقول تیار کی گئیں، بعض روایات کے مطابق پانچ اور بعض
 میں سات کا عدد بھی ملتا ہے۔ ان میں سے ایک مصحفِ official version کے طور پر
 مدینے میں رکھا گیا اور باقی نقلیں مکہ مکرمہ، دمشق، کوفہ، یمن، بحرین اور بصرہ کو بھیج دی
 گئیں۔ ان میں سے کوئی کوئی نقل اب بھی موجود ہے۔ ترکی اور تاشقند میں وہ ”مصاحفِ
 عثمانی“ موجود ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تیار کرائے تھے۔

یہاں ایک اہم بات توجہ طلب ہے کہ ہمارے ہاں خطبات جمعہ میں بعض خطیب یہ

جملہ پڑھ جاتے ہیں: ”جامعُ آیاتِ القرآن عثمان بن عفانؓ۔“ یہاں ہم قاف
الفاظ جمع کر کے صوتی آہنگ کے ساتھ ایک خاص انداز پیدا کیا گیا ہے، لیکن یہ الفاظ
اس قدر غلط اور اتنے گمراہ کن ہیں کہ اس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کو سزا
سے پہلے حضرت عثمانؓ نے جمع کیا۔ یہ بات قرآن پر سے اعتماد کو ہٹا دینے کا
ہے۔ آیات قرآنیہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جمع ہو چکی تھیں، سورتیں حضور ﷺ
زمانے میں وجود میں آچکی تھیں، سورتوں کی تدوین ہی نہیں ترتیب بھی حضور ﷺ
زمانے میں عمل میں آچکی تھی۔ کتابی شکل میں قرآن ابو بکرؓ کے زمانے میں جمع ہو
حضرت عثمانؓ اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں دس پندرہ سال کا فصل ہے۔ ا
”جامعُ آیاتِ القرآن“ حضرت عثمانؓ کو قرار دیا جائے تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے
قرآن کی تدوین حضور ﷺ کے پندرہ یا بیس برس بعد ہوئی ہے۔ حضرت عثمانؓ کا
خلافت بارہ برس ہے اور حضور ﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس بعد ان کا انتقال ہوا۔ تو ان
طرح قرآن کے متن (text) کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کیے جاسکتے ہیں،
حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ آیات قرآنیہ کے جمع کرنے والے نہیں ہیں،
امت کو قرآن کے ایک ٹیکسٹ اور رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ اسی لیے آج
میں جو مصحف موجود ہے یہ ”مصحف عثمان“ کہلاتا ہے۔ اس کا نام ”مصحف“ حضرت
ابو بکرؓ نے رکھا تھا اور مصحف عثمان میں رسم الخط اور ٹیکسٹ معین ہو گیا کہ اب قرآن
اسی طریقے سے لکھا جائے گا اور یہی پوری دنیا کے اندر official ٹیکسٹ ہے۔

ہمارے ہاں اکثر و بیشتر قرآن پاک کی اشاعت کے ادارے رسم عثمانی کا
اہتمام نہیں کرتے اور اس اعتبار سے ان میں رسم کی غلطیاں بھی آ جاتی ہیں اس لیے
ان کے سامنے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں یعنی کم خرچ سے زیادہ نفع حاصل کر
کی کوشش۔ لیکن اب سعودی حکومت نے اس کا اہتمام کر کے بڑی نیکی کمائی ہے
قرآن مجید کی حفاظت کے حوالے سے ایک نیکی مصر نے کمائی تھی۔ جب اسرائیل
قراءت قرآن مجید کے اندر تحریف کر کے اس کو عام کرنے کی کوشش کی تو حکومت

نے اپنے چوٹی کے قراء قاری محمود خلیل صہری اور عبدالباسط عبدالصمد سے پورا قرآن مجید مختلف قراءتوں میں تلاوت کرایا اور ان کے کیسٹس تیار کر کے دنیا میں پھیلا دیئے کہ اب گویا وہ ریفرنس کا کام دیں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے اب کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس طرح قراءت کے حوالے سے قرآن میں کوئی تحریف کر سکے۔ اسی طرح سعودی عرب کی حکومت نے کروڑوں روپے کے خرچ سے بہت بڑی فاؤنڈیشن بنائی ہے جس کے زیر اہتمام بڑے عمدہ آرٹ پیپر پر عالمی معیار کی بڑی عمدہ جلد کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں یہ قرآن مجید چھاپے جا رہے ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معین کردہ رسم الخط کے مطابق ہیں۔

بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ”جامع آیات القرآن“ کی بجائے ”جامع الامۃ علی رسم واحد“ یعنی امت کو قرآن حکیم کے ایک رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ یہ تدوین بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ۲۳ برس کے اندر مکمل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا مانتی ہے اور تمام مستشرق مانتے ہیں کہ جتنا خالص متن (pure text) قرآن کا دنیا میں موجود ہے کسی دوسری کتاب کا موجود نہیں ہے۔ یہ بات ”الفضل ما شہدت بہ الاعداء“ کا مصداق ہے یعنی فضیلت تو وہ ہے جس کو دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اور یہ کسی شے کی حقانیت کے لیے آخری ثبوت ہوتا ہے۔ پس یہ بات پوری دنیا میں مسلم ہے کہ قرآن حکیم کا ٹیکسٹ محفوظ ہے یا جتنا محفوظ ٹیکسٹ قرآن کا ہے اتنا اور کسی کتاب کا نہیں ہے۔ یعنی قراءت کے فرق بھی ریکارڈ پر ہیں سب سے قراءت اور عشرہ قراءت ریکارڈ پر ہیں ان میں بھی ایک ایک حرف کا معاملہ مدون ہے کہ فلاں قراءت میں یہ لفظ زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے یا زیر کے ساتھ۔ اور یہ تمام official قراءت ات ہیں۔ باقی جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے اس کا ٹیکسٹ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معین کر دیا۔ امت مسلمہ پر یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ قرآن حکیم کی compilation اور اس کی تدوین کے متعلق یہ چیزیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ یہ حقائق سامنے نہ ہوں تو کچھ لوگ ذہنوں میں شلوک و شبہات پیدا کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید کا موضوع

اب ہم اگلی بحث پر آتے ہیں کہ قرآن کا موضوع کیا ہے۔ کیا قرآن فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ سائنس کی کتاب ہے؟ کیا یہ جیالوجی یا فنرکس کی کتاب ہے؟ کس قسم کی کتاب ہے؟ تو پہلی بات یہ سمجھئے کہ قرآن کا موضوع ہے انسان — لیکن انسان کی انٹومی اس کی فزیالوجی یا anthropology نہیں بلکہ انسان کی ہدایت۔ یہ ہدایت کا لفظ قرآن مجید کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ البقرۃ کے شروع ہی میں فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ پھر اس کے وسط میں ارشاد ہوا: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یعنی پوری نوع انسانی کے لیے ہدایت۔ سورۃ یونس میں فرمایا: ﴿هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾۔ سورۃ لقمان میں فرمایا: ﴿هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ﴾۔ سورۃ البقرۃ اور سورۃ النمل میں ﴿هُدًى وَبُشْرَىٰ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ جبکہ سورۃ آل عمران اور سورۃ المائدۃ میں ﴿هُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾ کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ ”ہُدًى“ کا لفظ قرآن حکیم کے لیے کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر یہ صرف نکرہ نہیں ”ال“ کے ساتھ معرفہ بن کر بھی کئی جگہ آیا ہے۔ تین مرتبہ تو اس آیت مبارکہ میں آیا جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو بیان کرتی ہے: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (التوبہ: ۳۳، الحج: ۲۸، القف: ۹) ہُدًى نکرہ تھا اَلْهُدَىٰ معرفہ ہو گیا۔ یعنی ہدایت کاملہ ہدایت تامہ ہدایت ابدی۔ اسی طرح سورۃ النجم میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ﴾۔ سورۃ الجن کا آغاز جنات کی ایک جماعت کے اس قول ﴿أَنَا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا﴾ سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَأَنَا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ آمَنَّا بِهِ﴾ (آیت ۱۳)

گویا سورۃ الجن نے معین کیا کہ ”قُرْآنًا عَجَبًا“ اور ”الْهُدَى“ مترادف الفاظ ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں آیا ہے: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمْ الْهُدَى﴾ (بنی اسرائیل: ۹۳، الکہف: ۵۵)۔ ”کیا شے ہے جو لوگوں کو ایمان لانے سے روکتی ہے جبکہ ان کے پاس الہدیٰ آیا ہے؟“ تو گویا قرآن کا موضوع ہے انسان کی ہدایت۔

اب یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان کے علم کے دو گوشے ہیں، علم انسانی دو حصوں میں منقسم ہے۔ (مشہور کہادت ہے: الْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الْأَبْدَانِ وَعِلْمُ الْأَدْيَانِ) ایک حصہ ہے مادی دنیا (Physical World) کا علم، مادی حقائق کا علم، جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا، چھونا ہمارے حواسِ خمسہ ہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں ہیں جن سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور عقل کا کمپیوٹر ان کو پراسیس کرتا ہے، ان سے نتائج نکالتا ہے اور انہیں شور کر لیتا ہے۔ پھر حواس کے ذریعہ سے مزید کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں تو اب ان کو بھی وہ پراسیس کر کے اپنے سابقہ ”memory store“ کے ساتھ ہم آہنگ کر کے کوئی اور نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ انسان کا یہ علم بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ابھی اور کہاں تک جائے گا۔ آج سے سو سال پہلے بھی انسان تصور نہیں کر سکتا تھا کہ انسانی علم وہاں پہنچ جائے گا جہاں آج پہنچ چکا ہے۔ یہ علم بالحواس و العقل ہے اور اس علم کا وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اس علمِ آسماء سے ہے جو بالکل شروع میں حضرت آدم علیہ السلام میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور یہی دنیا میں سر بلندی کی بنیاد ہے۔

علم انسانی کے دو گوشوں کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کا چوتھا رکوع بہت اہم ہے۔ علمِ آسماء کا ذکر اس کے شروع میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں کی طرف سے یہ بات استفہاناً پیش کی گئی: ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ (آیت ۳۰) ”کیا آپ اس کو زمین میں خلیفہ بنائیں گے جو اس میں فساد پھیلانے کا اور خون ریزیاں کرے

گا؟“ فرشتوں کا یہ اشکال اس طرح زور کیا گیا کہ ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (آیت ۳۱) ”اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیئے۔“ یہ علم اسماء جو آدم کو دیا گیا یہی حکومتِ ارضی کی بنیاد ہے۔ جو قوم اس علم کے اندر ترقی کرے گی وہی اقتدارِ ارضی کی حق دار ٹھہرے گی۔ البتہ اس رکوع کے آخر میں فرمایا گیا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہو گئی اور شیطان کے اغوا سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کا بایں طور اعلان کر دیا: ﴿فَلَقَىٰ آدَمَ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۗ﴾ (آیت ۳۷) اس کے بعد ذکر ہے کہ جب آدم اور حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا کہ اب زمین میں جا کر رہو اور وہاں کا چارج سنبھالو تو فرمایا: ﴿فَاَمَّا يَاۤئْتِيَنَّكُمْ مِّنۡنِي هُدًى فَمَنِ تَبَعَ هٰذَاۤى فَلَآ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَّلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ ”تو جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔“ وہ علم ہدایت ہے۔

یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علمِ اسماء درحقیقت یوں سمجھئے کہ جیسے آم کی گٹھلی میں آم کا پورا درخت ہوتا ہے۔ وہی گٹھلی تو ہے جو آپ زمین میں دباتے ہیں۔ پھر اگر وہاں پانی پڑتا ہے اور زمین میں روئیدگی کی صلاحیت بھی ہے تو وہ گٹھلی پھٹے گی۔ اس میں سے جو دو پتے نکلیں گے وہ پھلیں پھولیں گے، پروان چڑھیں گے تو درخت بنے گا۔ وہ پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوة (potentially) موجود تھا، البتہ اسے بالفعل (actually) پورا درخت بننے میں تین چار سال لگیں گے۔ تو جس طرح پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوة موجود تھا لیکن وہ آم کا درخت کئی سال کے اندر بالفعل وجود میں آیا، بعینہ یہ معاملہ کل مادی حقائق کا ہے کہ اس ضمن میں کل علم حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں بالقوة (potentially) ودیعت کر دیا گیا! اب اس کی exfoliation ہو رہی ہے وہ بڑھتا جا رہا ہے، برگ و بار لا رہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس علم کا کوئی تعلق آسمانی ہدایت سے نہیں ہے۔ اب یہ خود رو پودا ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے اور

معلوم نہیں کہاں تک پہنچے گا۔ علامہ اقبال نے اس کی صحیح تعبیر کی ہے۔
 عروج آدم خاکی سے انجم سبے جاتے ہیں
 کہ یہ ٹوٹا ہوا تار امہ کامل نہ بن جائے!

علامہ کی زندگی میں تو انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا تھا، لیکن اب انسان چاند پر قدم رکھ کر آ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اب تو جنیٹک انجینئرنگ اپنے کمالات دکھا رہی ہے۔ کلوننگ کے طریقے سے حیوانات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اس انسانی علم کے ساتھ اگر علم وحی یعنی علم ہدایت نہ ہو تو یہ علم بجائے خیر کے شر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ آج یہ علم واقعتاً شیطانی قوت بن چکا ہے، ہلاکت کا سامان بن چکا ہے، تباہی کا ذریعہ بن چکا ہے۔
 ﴿فَاِمَّا يَنْتَظِرُكُمْ مِّنِي هُدًى﴾ نے حضرت آدم عليه السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلى الله عليه وسلم تک ارتقائی مراحل طے کیے۔ جیسے جیسے نوع انسانی شعور کی منزلیں طے کرتی گئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت میں بھی اضافہ ہوتا گیا، تا آنکہ یہ علم ہدایت قرآن حکیم میں آ کر ”الْهُدَى“ (Final Guidance) کی صورت میں مکمل ہو گیا۔ اس ہدایت میں جو ارتقاء ہوا ہے اسے بھی آپ سمجھ لیجئے۔ پہلی کتابیں جو نازل ہوئیں ان میں بھی ہُدًى تو تھی۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيْهَا هُدًى وَنُورٌ﴾ (آیت ۴۴) ”ہم نے تورات نازل کی تھی اس میں ہدایت بھی تھی نور بھی تھا“۔ اسی رکوع میں (سورۃ المائدۃ کا ساتواں رکوع) انجیل کے بارے میں فرمایا: ﴿فِيْهِ هُدًى وَنُورٌ﴾ (آیت ۴۶) ”اس میں بھی ہدایت بھی تھی نور بھی تھا“۔ لیکن یہ ہدایت اور نور درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا ہے، یہاں تک کہ قرآن میں آ کر یہ کامل ہوا ہے اور الْهُدَى بن گیا ہے۔ اب یہ ہُدًى نہیں الْهُدَى ہے، یعنی ہدایت نامہ۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ دیکھئے ایک بچے کو اگر آپ تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اس کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں دے سکتے۔ آپ پر امری میں زیر تعلیم کسی بچے کے لیے چاہے پی ایچ ڈی استاد رکھ دیں، لیکن وہ استاد بچے کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے ہی اسے تعلیم دے سکے گا۔ پھر رفتہ رفتہ آگے بڑھے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی عقل اور شعور

کی پوری شدت، قوت اور بلوغت کو پہنچ جائے گا تب اسے آخری علم پڑھایا جائے گا۔ پہلے وہ تاریخ پڑھ رہا تھا اب فلسفہ تاریخ پڑھے گا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت تدریج کے ساتھ اتاری ہے۔ تورات میں صرف احکام ہیں، حکمت ہے ہی نہیں، جبکہ انجیل میں حکمت ہے، احکام ہیں ہی نہیں۔ دونوں چیزیں مل کر ایک بات کو مکمل کرتی ہیں۔ تورات میں صرف احکام ہیں۔ جیسے آپ بچے کو بتا دیتے ہیں کہ بھی کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، روزے کا مطلب یہ ہے کہ اب دن بھر کھانا پینا کچھ نہیں ہے۔ چاہے بچہ ابھی چھ سات سال کا ہے، وہ یہ بات سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح اسے احکام تو دے دیئے جائیں گے کہ یہ کر، یہ نہ کر، یہ Do's ہیں یہ Donts ہیں۔

چنانچہ تورات میں احکام عشرہ (The Ten Commandments) دے دیئے گئے، لیکن ابھی ان کی حکمت نہیں بتائی گئی۔ اس لیے کہ ابھی حکمت کا تحمل انسان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ابھی نوع انسانی کا عہد طفولیت تھا۔ یوں سمجھئے کہ وہ آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل کا انسان تھا۔ تورات چودہ سو قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔ اس کے چودہ سو سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی گئی، جس میں صرف حکمت ہے، احکام ہیں ہی نہیں۔ لیکن آج سے دو ہزار سال پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ الفاظ انجیل میں موجود ہیں (اب بھی موجود ہیں) کہ آپ نے اپنے حواریوں سے فرمایا تھا: ”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی تھیں، مگر ابھی تم ان کا تحمل نہیں کر سکو گے، جب وہ فارقلیط آئے گا تو تمہیں سب کچھ بتائے گا۔“ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی تھی۔ حضرت مسیح نے فرمایا کہ ابھی تم تحمل نہیں کر سکتے۔ گویا تمہاری ذہنی بلوغت کے لیے چھ سو برس مزید درکار ہیں۔ چنانچہ الہدیٰ قرآن حکیم میں آ کر مکمل ہوا ہے۔

قرآن مجید جو ہدایت دیتا ہے اس کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک فکر و نظر کی ہدایت ہے، جس کا عنوان ”ایمان“ ہے۔ اس کا موضوع وہی ہے جو فلسفے کا ہے۔ یعنی کائنات کی حقیقت کیا ہے، زندگی کی حقیقت کیا ہے، زندگی کا مال کیا ہے، اس کا آغاز کیا ہے، انجام کیا ہے، صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے، خیر کیا ہے، شر کیا ہے، علم کیا ہے؟ قرآن مجید کا دوسرا

موضوع ہدایت عملی ہے انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ یہ اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے احکام پر مشتمل ہے۔ پھر اس میں معاشی و معاشرتی احکام بھی ہیں۔ یہ ہدایت فکر و نظر اور ہدایت فعل و عمل (انفرادی و اجتماعی) قرآن حکیم کا موضوع ہے۔ اس ضمن میں یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی قرآن حکیم کا موضوع نہیں ہے قرآن مجید کتاب ہدایت ہے سائنس کی کتاب نہیں ہے البتہ اس میں سائنسی علوم کی طرف اشارے موجود ہیں اور ان کے حوالے موجود ہیں۔ قرآن مجید کائناتی حقائق کو آیات الہیہ قرار دیتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ملاحظہ کیجئے جسے میں آیت الآیات قرار دیتا ہوں:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَخْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ - وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۶۴﴾﴾

”یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں رات اور دن کے عیم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر بے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، اُن لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان میں اللہ کی قدرت، اللہ کی عظمت، اللہ کا علم، کامل، اللہ کی حکمت بالغہ سب کچھ شامل ہے۔ تو یہ جو مظاہر طبیعی (Physical phenomena) ہیں، قرآن حکیم ان کا جا بجا حوالہ دیتا ہے۔ بعض کائناتی حقائق وہ ہیں جن کا تعلق فلکیات (astronomy) سے ہے۔ فرمایا: ﴿وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿۱۶۴﴾﴾ یعنی

یہ تمام اجرامِ سماویہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہر شے حرکت میں ہے۔ انسان پر ایک دور ایسا گزرا ہے جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ پھر ایک دور آیا جس میں کہا گیا کہ نہیں، سورج ساکن ہے، زمین حرکت کرتی ہے، زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے، اور آج ہمیں معلوم ہوا کہ ہر شے حرکت میں ہے۔ سورج کا بھی اپنا ایک مدار ہے، اس میں وہ اپنے پورے کنبے سمیت حرکت کر رہا ہے۔ یہ نظام شمسی اس کا کنبہ ہے، اس پورے کنبے کو لے کر وہ بھی ایک مدار میں حرکت کر رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ الفاظ قرآنی: ﴿كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ میں ”کُلٌّ“ کا لفظ جس طرح متخ اور مبرہن ہو کر، جس شان کے ساتھ آج ہو پیدا ہوا ہے، آج سے پہلے انسان کو معلوم نہیں تھا۔ قرآن مجید میں کائناتی مظاہر کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ حقیقت ہے جو اس دور میں آ کر پوری طرح واضح ہوئی ہے۔

ڈاکٹر مورلیس بوکانی ایک فرانسیسی سرجن تھے۔ انہوں نے قرآن اور بائبل دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ واضح رہے کہ بائبل سے مراد عہد نامہ قدیم (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New Testament) دونوں ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پورے قرآن میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہمارے سائنسی انکشافات میں سے کسی نے غلط ثابت کیا ہو، جب کہ تورات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ سائنس انہیں غلط ثابت کر چکی ہے۔ اس پر انہوں نے ۲۵۰ صفحات کی کتاب تحریر کی: "The Bible, The Quran and Science"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تورات بھی تو اللہ کی کتاب ہے، پھر اس میں ایسی چیزیں کیوں آ گئیں جو سائنسی حقائق کے خلاف ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی جبکہ بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی ہوئی تھی۔ اس کے ڈیڑھ سو برس بعد کچھ لوگوں نے تورات کو یادداشتوں سے مرتب کیا۔ لہذا اُس وقت انسانی علم کی جو سطح تھی اس کے اعتبارات سے تاویلات

تورات میں شامل ہو گئیں، کیونکہ انسان تو اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی سوچ سکتا ہے۔
 تورات میں تحریف ہونے کی وجہ سے اس میں ایسی چیزیں در آئیں جو سائنس کی رو
 سے غلط ثابت ہوئیں۔ البتہ قرآن میں ایسی کوئی تاویل نہیں ہوئی اور اس کی حفاظت کا
 اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے۔ اس کو بڑے خوبصورت انداز میں
 ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کہا ہے کہ یہ کائنات اللہ کا فعل ہے۔ اس کی تخلیق اور اس کی
 تدبیر ہے جبکہ قرآن اللہ کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول و عمل میں تضاد ممکن نہیں ہے۔
 کسی انسان کے قول و عمل میں بھی اگر کوئی تضاد ہو تو وہ انسانیت کی سطح سے نیچے اتر جاتا
 ہے اللہ تعالیٰ کے قول اور عمل میں تضاد کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دور
 میں انسانوں نے بات سمجھی نہ ہو، ان کا ذہن وہاں تک پہنچانا نہ ہو، ان کی معلومات کا دائرہ
 ابھی اس حد تک ہو کہ ان حقائق تک نہ پہنچا جاسکے۔ لیکن جیسے جیسے وقت آئے گا مزید
 حقائق منکشف ہوں گے اور یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائے
 گی کہ جو کچھ قرآن نے فرمایا ہے وہی برحق ہے۔ ہاں آج سے پہلے انسانی ذہن اس
 حد تک رسائی حاصل کرنے کا اہل نہیں تھا۔ سورۃ حم السجدۃ کی آخری سے پہلی آیت
 ذہن میں رکھیے:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَلِيَوْمِ انْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّ اللَّهَ الْحَقُّ ۗ﴾

”ہم انہیں دکھاتے چلے جائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود ان کی
 جانوں میں بھی یہاں تک کہ یہ بات پوری طرح کھل کر ان کے سامنے واضح ہو
 جائے گی کہ یہ قرآن ہی حق ہے۔“

ڈاکٹر کیتھ این مور کینیڈا کے بہت بڑے ایمبرالوجسٹ ہیں۔ ان کی کتاب علم
 جنین (Embriology) میں سند مانی جاتی ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر بطور نیکسٹ بک
 پڑھائی جاتی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی حیرت کا اظہار
 کیا ہے کہ آج سے چودہ سو برس قبل جبکہ نہ مائیکروسکوپ موجود تھی اور نہ ہی
 dissection تھا، قرآن نے علم جنین کے متعلق جو معلومات دی ہیں وہ صحیح

ترین حقائق پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف سورۃ المؤمنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ کا مطالعہ کرتے ہوئے انگشت بدنداں ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۖ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۚ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَرْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۗ﴾

”ہم نے انسان کو مٹی کے سٹ سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ تک بھی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو توہمزے کی شکل دی، پھر توہمزے کو بونی بنا دیا، پھر بونی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔“

ان کا کہنا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ انسانی تخلیق کے مراحل کی اس سے زیادہ صحیح تعبیر ممکن نہیں ہے۔ تو یہ حقیقت ذہن میں رکھیے کہ اگرچہ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے، لیکن جن سائنسی حقائق یا سائنسی مظاہر (phenomena) کا قرآن نے حوالہ دیا ہے وہ یقیناً حق ہیں، چاہے تاحال ہم ان کی حقانیت کو نہ سمجھ پائے ہوں۔ مثلاً آج بھی مجھے نہیں معلوم کہ قرآن جو ”سات آسمان“ کہتا ہے تو ان سے کیا مراد ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب انسان سمجھے گا کہ ”سات آسمان“ کے یہ الفاظ ٹھیک ٹھیک اس حقیقت پر منطبق ہوتے ہیں جو آج ہمارے علم میں آئی ہے، پہلے نہیں آئی تھی۔ البتہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، عملی اعتبار سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن سائنس یا ٹیکنالوجی کی کتاب نہیں ہے اور اس حوالے سے ایک بڑا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ہمارے اسلاف نے اپنے خود کی معلومات کی سطح پر قرآن کی ان آیات کا کوئی خاص مفہوم معین کیا تو ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ ہم قرآن میں بیان کردہ سائنسی مظاہر کو اس سائنسی ترقی کے حوالے سے سمجھیں گے جو روز بروز ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ آخری بات عرض کر رہا ہوں کہ اس معاملے میں خود محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی اگر کوئی بات منقول ہو تو وہ بھی قطعی نہیں سمجھی جائے گی، کیونکہ حضور ﷺ نے یہ چیزیں سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ یہ بات اگرچہ بہت سے لوگوں پر نقل اور

گراں گزرے گی لیکن صحیح طرز عمل یہی ہوگا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں اگر حضور ﷺ کی کوئی حدیث بھی سامنے آجائے تو اس کو بھی ہم دلیل قطعی نہیں سمجھیں گے۔ اس سلسلے میں تائیر نخل کا واقعہ بہت اہم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی پیدائش مکہ کی ہے، ہجرت تک ساری زندگی آپ نے وہاں گزاری، وہ وادی غیر ذی زرع ہے، جہاں کوئی پیداوار کوئی زراعت، کوئی کاشت ہوتی ہی نہیں تھی، لہذا آپ کو اس کا کوئی تجربہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ ہاں تجارت کا بھرپور تجربہ تھا اور اس کے تمام اسرار و رموز سے آپ واقف تھے۔ آپ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ کھجوروں کے سلسلہ میں انصار مدینہ ”تائیر نخل“ کا معاملہ کرتے تھے۔ کھجور ایک ایسا پودا ہے جس کے زراور مادہ پھول علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگر اس کے زراور مادہ پھولوں کو قریب لے آئیں تو اس کے بار آور ہونے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ اہل مدینہ کو یہ بات تجربے سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اس پر عمل پیرا تھے۔ مدینہ تشریف آوری پر رسول اللہ ﷺ نے جب اہل مدینہ کا یہ معمول دیکھا تو ان سے فرمایا کہ اگر آپ لوگ ایسا نہ کریں تو کیا ہے؟ ایسا نہ کرنا شاید تمہارے حق میں بہتر ہو۔ یہ بات آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد اور فہم کے مطابق اس بنیاد پر فرمائی کہ فطرت اپنی دیکھ بھال خود کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت کا نظام انسانوں پر نہیں چھوڑا، بلکہ یہ تو خود کار نظام ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ لوگ اس قدرتی نظام میں دخل نہ دیں تو کیا ہے؟ البتہ آپ نے روکا نہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے حضور ﷺ کا اتنا کہنا بھی گویا حکم کے درجہ میں تھا۔ انہوں نے اس سال وہ کام نہیں کیا، لیکن فصل کم ہوگئی۔ اب وہ ڈرتے ڈرتے، جھکتے جھکتے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضور! ہم نے اس مرتبہ تائیر نخل نہیں کی تو فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((انتم اعلمم بامور دنیاکم)) اس حدیث کا ایک ایک لفظ یاد کر لیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو تمہارے اپنے ذنبوی اور مادی معاملات ہیں جن کی بنیاد تجربہ پر ہے، یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تم زیادہ تجربہ کار ہو، تم ان حقائق سے زیادہ

واقف ہو۔ ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں :
 ((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَاعْبُدُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ)) ”میں تو ایک بشر ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اس سے سرتابی نہ کرنا، لیکن جب میں تمہیں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو جان لو کہ میں ایک بشر ہی ہوں۔“ (یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کی ہیں۔
 کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله ﷺ شرعاً دون ما ذكره من معاش الدنيا على سبيل الرأي) گویا آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ میں یہ چیزیں سکھانے نہیں آیا، میں جو کچھ سکھانے آیا ہوں وہ مجھ سے لولا!

اس اعتبار سے یہ حدیث بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے آپ ﷺ کو نبی سکھانے نہیں آئے تھے۔ آپ طب و جراحات سکھانے نہیں آئے تھے، آپ کوئی اور سائنس پڑھانے نہیں آئے تھے۔ ورنہ تو ہم شکوہ کرتے کہ آپ نے ہمیں ایٹم بم بھٹا کیوں نہیں سکھا دیا؟ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمادیا کہ ((أَنْتُمْ أَكْبَرُ دُنْيَاكُمْ)) تو ہمارے لیے یہ بات آخری درجے میں سند ہے کہ جیسے جیسے سائنسی انکشافات ہو رہے ہیں، جیسے جیسے علم انسانی کی exploration ہو رہی ہے، ویسے ویسے حقائق فطرت ہماری نگاہوں کے سامنے عکس ہو رہے ہیں۔ جیسے آتم کی گھنٹی سے آتم کا پورا درخت وجود میں آتا ہے ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں علم بالحواس اور علم بالعقل کا جو mechanism رکھ دیا گیا تھا، یہاں کا نتیجہ ہے کہ علم کلل رہا ہے۔ اس سے جو بھی چیزیں ہمارے سامنے آئیں ان میں کھل رکاوٹ نہیں ہے کہ ہم حلق کی بات کولنے کر چھہ جائیں کہ سائنس خواہ کچھ بھی کہے ہم تو اختلاف کی بات مانیں گے۔ یہاں پر اس طرز عمل کے لیے کوئی دلیل اور بنیاد نہیں۔

قرآن کا اصل موضوع ایمان ہے۔ مادراء الطبیعیاتی حقائق عالم غیب سے متعلق ہیں جو ہمارے عالم محسوسات سے مادراء ہیں، جنہاں کہ خبریں ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہیں۔ علم حقیقت جسے ہم اجمالی طور پر ایمان کہتے ہیں یہ قرآن کا اصل موضوع نہیں ہے۔

ہدایت فکری و عملی۔ تمدنی میدان میں معاشی و اقتصادی اور معاشرتی میدان میں یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ یہ چیزیں کھانے پینے کی ہیں یہ چیزیں کھانے پینے کی نہیں ہیں۔ یہ حرام ہیں یہ نجس ہیں۔ یہ علم حضور ﷺ نے دیا ہے اور قرآن کا موضوع اصل میں یہی ہے۔ البتہ قرآن میں جو سائنسی ریفرنسز آئے ہیں وہ غلط نہیں ہیں وہ لازماً درست ہیں۔

انسانی علم کے تین دائرے ہیں۔ ایک علم بالحواس ہے یہ انسانی علم کا پہلا دائرہ ہے۔ حواس کے ذریعے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں جنہیں آج کل ہم sense data کہتے ہیں۔ آنکھ نے دیکھا، کان نے سنا ہاتھ نے اس کی پیمائش کی۔ اس کے بعد دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ عقل sense data کو پراسیس کرتی ہے۔ اس ضمن میں استدلال اور استنباط کے اصول معین کیے گئے ہیں۔ انسان اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے پھر عقل ان معلومات کو process کرتی ہے تو انسان کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یوں عقل حواس کی محتاج ہوئی، لیکن عقل و حواس کے ماوراء بھی ایک علم ہے جسے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے علم بالقلب کا نام دیا ہے۔ آج اسے extra sensory

perceptions کہا جا رہا ہے۔ یہ علم کا تیسرا دائرہ ہے۔ اس سے پہلے ادب میں اس کے لیے وجدان (intuition) کا لفظ تھا۔ یہ علم بالقلب درحقیقت وہ خاص انسانی علم ہے جس سے آج کے مادہ پرست واقف نہیں ہیں۔ وحی کا تعلق اسی تیسرے دائرے سے ہے۔ اس لیے کہ وحی کا نزول قلب پر ہوتا ہے۔ لہذا روئے الفاظ قرآنی

﴿لَوْ كَانَ فِيهِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ غَلِيظِ لِسَانٍ لَّكَلَّمْنَا مِنْ قَبْلِهِ﴾ (الشعراء)

عقل اور حواس سے حاصل ہونے والے علوم میں تمام فزیکل سائنسز میڈیکل سائنسز اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل ہیں۔ انسان نے مختلف چیزوں کے خواص معلوم کیے کچھ طبی اور کیمیائی تبدیلیوں کے اصول دریافت کیے۔ پھر ان اصولوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کو استعمال کیا۔ اس سے انسان کی ٹیکنالوجی ترقی کرتی جا رہی ہے اور ابھی نامعلوم کہاں تک پہنچے گی۔ یہ ایک علم ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ﴿عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ کے الفاظ میں کر دیا گیا۔ البتہ انسان صرف اس علم پر قانع

نہیں رہا، اس لیے کہ اس سے تو صرف جزوی علم حاصل ہوتا ہے، انسان ایک ایک جزو قدم بقدم سیکھتا ہے۔ انسان کی ایک طلب (urge) ہے کہ وہ ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ میری حقیقت کیا ہے؟ علم کی حقیقت، خیر و شر کی حقیقت کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ آج سے ایک ہزار سال قبل کے انسان کی معلومات (علم بالجواس اور علم بالعقل کے اعتبار سے) بڑی محدود تھیں، لیکن اُس وقت کے انسان کو بھی اس چیز کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی رائے قائم کرے کہ یہ کائنات جس کام میں ایک فرد ہوں، اس کی حقیقت کیا ہے، خود میری حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کا آغاز کیا ہے؟ میرا اس کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے؟ اس سفر کی منزل کیا ہے؟ میں اپنی زندگی میں کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ کیا کرنا صحیح ہے؟ کیا کرنا غلط ہے؟ یہ انسان کی ضرورت ہے۔ لہذا اس ضرورت کے تحت جب انسان نے سوچنا شروع کیا تو فلسفہ کا آغاز ہوا جو گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے پھر انسان نے عقل کے گھوڑے دوڑائے، اپنی منطق کو استعمال کیا۔ فلسفہ مابعد الطبیعیات، الہیات، اخلاقیات اور نفسیات، یہ تمام علوم انسانی علوم میں سے ہیں۔ گویا کہ علم بالجواس اور علم بالعقل کے نتیجے میں یہ دو علم وجود میں آئے۔ ایک فزیکل سائنسز کا علم جس کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہے، دوسرا سوشل سائنسز کا علم جس میں فلاسفی، سوشیالوجی، نفسیات، اخلاقیات، اقتصادیات اور سیاسیات وغیرہ شامل ہیں۔

جان لیجے کہ ہڈی جس کی کھمبلی شکل ”الہدیٰ“ قرآن مجید ہے، اس کا موضوع انسانی علم کا دائرہ اول نہیں ہے۔ یہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی سائنس پڑھانے یا ٹیکنالوجی سکھانے آئی ہے۔ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے۔ اگرچہ قرآن حکیم میں سائنسی مظاہر کی طرف حوالے موجود ہیں اور وہ لازماً درست ہیں، لیکن وہ قرآن کا اصل موضوع نہیں ہے۔ جیسے جیسے انسان کے سائنسی علم میں تدریجاً ترقی ہو رہی ہے اسی طرح ان ریفرنسز کو سمجھنا بھی انسان کے لیے ممکن ہو رہا ہے۔ البتہ قرآن کا اصل موضوع مابعد الطبیعیات ہے۔ پھر فکر و عمل دونوں کے لیے راہنمائی درکار ہے، جیسے کہ کسی

راتے پر چلنے والے کو "روڈ سائز" کی ضرورت ہوتی ہے کہ ادھر نہ جانا ادھر خطرہ ہے ہلاکت ہے۔ اسی طرح انسان کو سفر حیات میں ان cautions کی ضرورت ہے کہ ادھر خطرہ ہے یہ تمہارے لیے ممنوع ہے یہ حرام ہے یہ نقصان دہ ہے اس میں ہلاکت ہے چاہے تمہیں ہلاکت نظر نہیں آ رہی لیکن تم ادھر جاؤ گے تو تمہارے لیے ہلاکت ہے۔ درحقیقت یہ قرآن کا اصل موضوع ہے۔

فہم قرآن کے اصول

فہم قرآن کے سلسلہ میں درج ذیل عنوانات کی تفہیم ضروری ہے۔

(۱) قرآن کریم کا اسلوب استدلال

قرآن کے طالب علم کو جاننا چاہیے کہ قرآن کا اسلوب استدلال منطقی نہیں، فطری ہے۔ انسان جس فلسفے سے واقف ہے اس کی بنیاد منطقی ہے۔ چنانچہ ہمارے فلاسفہ اور منطکین استخراجی منطق (Deductive Logic) سے اعتناء کرتے رہے ہیں جبکہ قرآن مجید نے اسے سرے سے اختیار نہیں کیا۔ وقتی تقاضے کے تحت ہمارے منطکین نے اسے اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں پہنچ پایا۔ ایمانی حقائق کو جب استخراجی منطق کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو یقین کم اور شک زیادہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں کانٹ کی بات حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے لہذا علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات کا آغاز اسی حوالے سے کیا ہے۔ کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کر دیا کہ کسی منطقی دلیل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ منطق میں اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے ایک دلیل لائیں گے تو منطق کی دوسری دلیل اسے کاٹ دے گی۔ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق، منطق کو کاٹ دے گی۔ قرآن نے اگرچہ کہیں کہیں منطق کو استعمال تو کیا ہے لیکن وہ بھی منطقی اصطلاحات میں نہیں۔ قرآن مجید کا اسلوب استدلال فطری ہے اور اس کا انداز خطابی ہے۔ جیسے ایک خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو جہاں وہ عقلی دلائل دیتا ہے وہاں جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے۔ اس سے اس کے خطبے میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ ایک لیکچر میں زیادہ تر دارو مدار منطق پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسی دلیل جو عقل کو قائل کر سکے۔ لیکن شعلہ بیان خطیب انسان کے

جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ اس کو خطابی دلیل کہا جاتا ہے۔ یہی خطابی انداز اور استدلال قرآن نے استعمال کیا ہے۔

انسان کی فطرت میں کچھ حقائق موجود ہیں۔ قرآن کے پیش نظر ان حقائق کو ابھارنا مقصود ہے۔ یعنی انسان کو آمادہ کیا جائے کہ مع

”اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی!“

عقل اور منطق کا دائرہ تو بڑا محدود ہے۔ انسان اپنے اندر جمائے ہوئے اس کے اندر صرف عقل ہی نہیں ہے، کچھ اور بھی ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

ہے نور تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں

غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے!

یہ جو اس کے اندر ”کوئی اور“ شے بھی ہے اسے اپیل کرنا ضروری ہے تاکہ انسان فطرت کی بنیاد پر اپنے اندر جمائے اور محسوس کرے کہ ہاں یہ ہے! تاہم اس کے لیے کوئی منطقی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ تو یہ نور علی نور ہوگا۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کا فطری طرز استدلال۔ بعض مقامات پر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن اپنے مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہہ رہا ہے اور اسے توجہ دلا رہا ہے کہ ذرا غور کر ڈسو جو اپنے اندر جمائے۔ جیسے سورۃ ابراہیم کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا: ﴿إِنِّي اللَّهُ شَنَّكَ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ”کیا اللہ کی ہستی میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟“ یہاں کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، لیکن مخاطب کو دروں بینی پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے اندر جمائے، تمہیں اپنے اندر ثبوت ملے گا، تمہیں اپنے اندر اللہ کی ہستی کی شہادت ملے گی۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّكُمْ لَتَشٰهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهَةً اٰخَرٰی﴾ ”کیا تم واقعی اس بات کی گواہی دے رہے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟“ یعنی تم یہ بات کہہ تو رہے ہو، لیکن ذرا سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہاری فطرت اسے تسلیم کرتی ہے؟ اپنے باطن میں جمائے، کیا تمہارا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ تو اس کے مدعی تھے اور اپنے معبودانِ باطل کے

لیے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس خطابی دلیل کے پس منظر میں یہ حقیقت موجود ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ محض ایک عقیدہ (dogma) ہے جو چلا آ رہا ہے تمہارے باپ دادا کی روایت ہے اس کی حیثیت تمہارے نسلی اعتقادات (racial creed) کی ہے۔ قرآن مجید درحقیقت انسان کی فطرت کے اندر جو شے مضمر ہے اسی کو ابھار کر باہر لانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اسلوب استدلال منطقی نہیں ہے بلکہ فطری ہے۔ اس کو خطابی انداز کہا جائے گا۔

(۲) قرآن حکیم میں محکم اور مشابہ کی تقسیم

سورۃ آل عمران کی آیت ۷ ملاحظہ کیجیے! ارشاد ہوا: ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ ”وہی ہے (اللہ) جس نے (اے محمد ﷺ) آپ پر کتاب نازل کی اس میں سے کچھ آیات حکمات ہیں وہی کتاب کی بڑ بنیاد ہیں اور دوسری مشابہ ہیں۔“ اس آیت میں لفظ کتاب دو دفعہ آیا ہے دونوں کے مفہوم میں باریک سا فرق ہے۔ مشابہ ان معانی میں کہ ان کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں اشتباہ ہو جاتا ہے وہ آیات مشابہات ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿فَلَمَّا لَدِينِ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ ”تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ مشابہ آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں (ان ہی پر غور و فکر اور ان ہی میں کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں) اُن کی نیت ہی فتنہ اٹھانے کی ہے اور وہ بھی ہیں جو اُس کا اصل مفہوم جانتا چاہتے ہیں۔“ ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ ”حالانکہ اس کے حقیقی معانی و مراد اللہ ہی جانتا ہے۔“ ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ ”البتہ جو لوگ علم میں پختگی کے حامل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس پوری کتاب پر (حکمات پر بھی اور مشابہات پر بھی) یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔“ ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ ”لیکن نصیحت نہیں حاصل کرتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں۔“ اللہ تعالیٰ ہمیں ان عقلمندوں اور ہوش مندوں میں شامل کرنے و راسخون فی العلم میں ہمارا شمار ہو!

محکم اور تشابہ سے مراد کیا ہے؟ جان لیجیے کہ ”محکم قطعی“ یعنی وہ محکم جن کے قطعی ہونے میں نہ پہلے کوئی شبہ ہو سکتا تھا نہ اب ہے نہ آئندہ ہوگا وہ تو قرآن حکیم کے اوامرو نواہی ہیں۔ یعنی یہ کرو یہ نہ کرو یہ حلال ہے یہ حرام ہے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے یہ پسندیدہ ہے یہ ناپسندیدہ ہے یہ اللہ کو پسند ہے اور یہ اللہ کو ناپسند ہے!

قرآن حکیم کا عملی حصہ درحقیقت حکمتِ ہی پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں کتاب کا لفظ دوسرے مرتبہ آیا ہے۔ پہلے بحیثیت مجموعی پورے قرآن کے لیے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ﴾ قرآن مجید کا جو حصہ عملی ہدایات پر مشتمل ہے اس کے لیے بھی لفظ ”کتاب“ مخصوص ہے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ جو لفظ کتاب آیا ہے ﴿هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ وہ اسی مفہوم میں ہے۔ جہاں کوئی شے واجب کی جاتی ہے وہاں ”کُتِبَ“ کا لفظ آتا ہے۔ جیسے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ..... كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ..... كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ نماز کے بارے میں فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا﴾ یہاں کتاب سے مراد وہ حکم ہے جو دیا گیا ہے تو ان معانی میں ﴿هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ سے مراد قانون شریعت، عملی ہدایات اور نواہی ہیں اور اصل میں وہی حکمت ہیں۔

دائمی تشابہات عالمِ غیب اور اس کے ضمن میں عالمِ برزخ، عالمِ آخرت، عالمِ ارواح، ملائکہ کا عالم اور عالمِ امثال وغیرہ ہیں۔ یہ درحقیقت وہ دائرہ ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس کی حقیقتوں کو کماحقہ اس زندگی میں سمجھنا محال اور ناممکن ہے۔ لیکن ان کا ایک علم دیا جانا ضروری تھا۔ مابعد الطبیعیات ایمانیات کے لیے ضروری ہے کہ اس سب کا ایک اجمالی خاکہ سامنے ہو۔ ہر انسان نے مرنا ہے مرنے کے فوراً بعد عالمِ برزخ میں یہ کچھ ہوتا ہے، بعث بعد الموت ہے، حشر نشر ہے، حساب کتاب ہے، جنت و دوزخ ہے۔ ان حقیقتوں کا اجمالی علم موجود نہ ہو تو بنیادی ضرورت کے طور پر انسان کو جو فلسفہ درکار ہے وہ اس کو فراہم نہیں ہوگا۔ لیکن ان کی حقیقتوں تک رسائی اس زندگی میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں لہذا ان کا جو علم دیا گیا ہے وہ آیات

تشابہات ہیں اور وہ داعماً تشابہات ہی رہیں گی۔ ہاں جب اُس عالم میں آنکھ کھلے گی تو اصل حقیقت معلوم ہوگی یہاں معلوم نہیں ہو سکتی۔

البتہ تشابہات کا ایک دوسرا دائرہ ہے جو تدریجاً تشابہات سے حکمت کی طرف آ رہا ہے۔ وہ دائرہ مظاہر طبیعی (physical phenomena) سے متعلق ہے۔ آج سے ہزار سال پہلے اس کا دائرہ بہت وسیع تھا، آج یہ کچھ محدود ہوا ہے، لیکن اب بھی بہت سے حقائق ہم نہیں جانتے۔ سات آسمانوں کی حقیقت آج تک ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ آگے چل کر ہمارا میٹریل سائنسز کا علم اس حد تک پہنچ جائے کہ معلوم ہو کہ یہ ہے وہ بات جو قرآن نے سات آسمانوں سے متعلق کہی تھی، لیکن اس وقت یہ ہمارے لیے تشابہات میں سے ہے۔ اسی طرح ایک آیت ﴿كُلُّ فِي قَلْبِكَ يَسْمَعُونَ﴾ (یس) (ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے) اس کو پہلے انسان نہیں سمجھ سکتا تھا، لیکن آج یہ حقیقت محکم ہو کر سامنے آگئی ہے کہ ح

”لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں!“

اگر آپ نظام شمسی کو دیکھیں تو ہر چیز حرکت میں ہے۔ کہکشاں کو دیکھیں تو ہر شے حرکت میں ہے۔ کہکشاں میں ایک دوسرے سے ذور بھاگ رہی ہیں، فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایک ذرے (atom) کا مشاہدہ کریں تو اس میں الیکٹرون اور پروٹون حرکت میں ہیں۔ گویا ہر شے حرکت میں ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل یہ بات تشابہات میں تھی، آج وہ حکمت کے دائرے میں آگئی ہے۔ چنانچہ بہت سے وہ سائنسی حقائق جو ابھی تک انسان کو معلوم نہیں ہیں اور ان کے حوالے قرآن میں ہیں، وہ آج کے اعتبار سے تو تشابہات میں شمار ہوں گے، لیکن انسان کا فزیکل سائنسز کا علم آگے بڑھے گا تو وہ تدریجاً تشابہات کے دائرے سے نکل کر حکمت کے دائرے میں آ جائیں گے۔

(۳) تفسیر اور تاویل کا فرق

تفسیر اور تاویل دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔ سورۃ آل عمران کی

متذکرہ بالا آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ ”اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ“۔ تفسیر کا لفظ قرآن مجید میں سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ ”اور نہیں لاتے وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات مگر ہم پہنچا دیتے ہیں (اس کے جواب میں) آپ کو ٹھیک بات اور بہترین طریقے سے بات کھول دیتے ہیں“۔ یہ لفظ قرآن میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے جبکہ تاویل کا لفظ سترہ (۱۷) بار آیا ہے۔ اس کے کچھ اور معانی بھی ہیں اور قرآن کے علاوہ کچھ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ تفسیر اور تاویل میں فرق کیا ہے؟ تفسیر کا مادہ ”ف س ز“ ہے۔ یہ گویا ”سز“ کی مہلب شکل ہے۔ سفر بمعنی Journey بھی ہے۔ اور اس کا مطلب روشنی بھی ہے کتاب بھی ہے۔ حروف ذرا آگے پیچھے ہو گئے ہیں لفظ ایک ہی ہے۔ تفسیر کا معنی ہے کسی شے کا کھولنا واضح کر دینا کسی شے کو روشن کر دینا، لیکن یہ زیادہ تر مفردات اور الفاظ سے متعلق ہوتی ہے جبکہ تاویل بحیثیت مجموعی کلام کا اصل مدلول ہوتی ہے کہ اس سے مراد کیا ہے اس سے اصل مقصود کیا ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ لہذا زیادہ تر یہی لفظ قرآن کے لیے مستعمل ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں اردو دان لوگ زیادہ تر لفظ تفسیر استعمال کرتے ہیں کہ فلاں آیت کی تفسیر فلاں لفظ کی تفسیر، لیکن اس کے لیے قرآن کی اصل اصطلاح تاویل ہی ہے اور حدیث میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے حضور ﷺ کی دعا منقول ہے: ((اللَّهُمَّ فَتِّهِمْ فِي الدِّينِ وَعَلِّمَهُمُ التَّأْوِيلَ)) یعنی اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور تفہیم عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما! چنانچہ کلام کی اصل حقیقت اصل مراد اصل مطلوب اصل مدلول کو پالینا تاکہ انسان اصل مقصود تک پہنچ جائے اسے تاویل کہتے ہیں۔ ع

”جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!“

اُؤل کا مادہ عربی زبان میں کسی شے کی طرف لوٹنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں ہم فلاں کی آل ہیں، یعنی وہ کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت

کرتے ہیں۔ ”آل فرعون“ کا مطلب فرعون کی اولاد نہیں ہے، بلکہ ”فرعون والے“ فرعونؑ ہے۔ وہ فرعون ہی کی اطاعت کرتے تھے اور اسی کو اپنا معبود یعنی حاکم اور پیشوا سمجھتے تھے۔ اسی معنی میں کسی عبارت کو اس کے اصل مفہوم کی طرف لوٹانا تاویل ہے۔ تفسیر اور تاویل کے مابین اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۴) تاویل عام اور تاویل خاص

قرآن حکیم کی کسی ایک آیت یا چند آیات کے مجموعے یا کسی خاص مضمون جو چند آیات میں مکمل ہو رہا ہے پر غور کرنے میں دوسرے ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں: ایک تاویل خاص، دوسرے تاویل عام۔ اس سلسلہ میں یاد رہے کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں نازل ہوا ہے۔ اس کا زمانہ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کے عرصے پر محیط ہے اور اس کے نزول کی جگہ سرزمینِ حجاز ہے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اُس وقت اور اُس علاقے کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور ان کی ذہنی سطح کو ملحوظ نہ رکھا جاتا تو ان تک ابلاغ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ تو آسمانی تھے پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگر انہیں فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا جاتا، سائنسی علوم کے بارے میں بتایا جاتا تو یہ باتیں اُن کے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں۔ قرآنی آیات تو ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئیں، کیونکہ براہِ راست ابلاغ تھا، کوئی barrier موجود نہیں تھا۔ تو قرآن حکیم کا یہ شانِ نزول ذہن میں رکھیے۔ ویسے تو ”شانِ نزول“ کی اصطلاح کسی خاص آیت کے لیے استعمال ہوتی ہے، لیکن ایک خاص time and space complex میں قرآن حکیم کا ایک مجموعی شانِ نزول ہے جس میں یہ نازل ہوا۔ وہاں کے حالات، اس عرصے کے واقعات، ان حالات میں تدریجاً جو تبدیلی ہوئی، پھر کون لوگ اس کے مخاطب تھے، مکے والوں کے عقائد، ان کی رسمیں ریتیں، ان کے نظریات، ان کے مسلمات، ان کی دلچسپیاں..... جب قرآن کو اس سیاق و سباق (context) میں رکھ کر غور کریں گے تو یہ تاویل خاص ہوگی۔ اسی میں آپ مزید تفصیل میں جائیں گے کہ فلاں آیت کا واقعاتی پس

منظر کیا ہے۔ یعنی قرآن مجید کی کسی آیت یا چند آیات پر غور کرتے ہوئے اولاً اس کو اس کے context میں رکھ کر غور کرنا کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت لوگوں نے ان کا مفہوم کیا سمجھا، یہ تاویل خاص ہوگی۔ البتہ قرآن مجید چونکہ نوع انسانی کی ابدی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے، صرف خاص علاقے اور خاص زمانے کے لوگوں کے لیے تو نازل نہیں ہوا، لہذا اس میں ابدی ہدایت ہے، اس اعتبار سے تاویل عام کرنا ہوگی۔

تاویل عام کے اعتبار سے الفاظ پر غور کریں گے کہ الفاظ کیا استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ جب ترکیبوں کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کیا ترکیبیں بنتی ہیں۔ پھر آیات کا باہمی ربط کیا ہے، سیاق و سباق کیا ہے؟ یہ آیات جس سورۃ میں آئیں اس کا عمود کیا ہے، اس سورۃ کا جوڑا کون سا ہے، یہ سورۃ کس سلسلہ سور کا حصہ ہے۔ پھر وہ سورتیں ملکی اور مدنی کون سے گروپ میں شامل ہیں، ان کا مرکزی مضمون کیا ہے؟ اس پس منظر میں ایک سیاق و سباق متن (text) کا ہوگا، جس سے ہمیں تاویل عام معلوم ہوگی اور ایک سیاق و سباق واقعات کا ہوگا، جس سے ہمیں ان آیات کی تاویل خاص معلوم ہوگی۔

اگر ہم قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے آیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس ترتیب سے اس وقت قرآن مجید موجود ہے اصل حجت یہی ہے، یہی اصل ترتیب ہے، یہی لوح محفوظ کی ترتیب ہے۔ تاویل عام کے اعتبار سے ایک اصولی بات یاد رکھیں: الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب۔ یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص شان نزول کا۔ دیکھا جائے گا کہ جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا مفہوم و معنی نیز مدلول کیا ہے۔ کلام عرب سے دلائل لائے جائیں گے کہ وہ انہیں کن معانی میں استعمال کرتے تھے۔ اُس لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ اُس کے شان نزول کا۔ لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ سب سے مناسب بات یہی ہوگی کہ پہلے اس کی تاویل خاص پر غور کریں اور پھر اس کے ابدی سرچشمہ ہدایت ہونے کے ناطے اس کے عموم پر غور کریں۔ اس اعتبار سے تاویل خاص اور

تاویل عام کے فرق کو ذہن میں رکھیں۔

(۵) تذکرہ تدبر

تذکرہ اور تذہب دونوں الفاظ الگ الگ تو بہت جگہ آئے ہیں سورۃ صٰ کی آیت ۲۹ میں لکھا آگئے ہیں: ﴿كَبَّ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبْرَكًا لِيُبَيِّنَ لَهُ الْبُيُوتَ وَيَسْئَلَ الْغَنَىٰ وَالْفَقْرَ وَلِيُنذِرَ أُولَٰئِكَ الْآلِفَابِ﴾ ”یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبی) ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔“ ان دونوں کا مطلب کیا ہے؟ ایک ہے قرآن مجید سے ہدایت اخذ کر لینا، نصیحت حاصل کر لینا، اصل راہ نمائی حاصل کر لینا، جس کو کہ مولانا روم نے کہا ہے ”ماز قرآن مغز ہا بردا بھیم“ یعنی قرآن کا جو اصل مغز ہے وہ تو ہم نے لے لیا۔ اس کا اصل مغز ”ہدایت“ ہے۔ اس مرحلے پر قرآن جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ”تذکرہ“ ہے۔ یہ لفظ ذکر سے بنا ہے۔ تذکرہ یاد دہانی کو کہتے ہیں۔ اب اس کا تعلق اسی بات سے جو جائے گا جو قرآن کے اسلوب استدلال کے ضمن میں پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی قرآن مجید جن اصل حقائق (مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں) کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ فطرت انسانی میں مضمر ہیں ان پر صرف ذہول اور نسیان کے پردے پڑ گئے ہیں۔ مثلاً آپ کو کوئی بات کچھ عرصہ قبل معلوم تھی، لیکن اب اس کی طرف دھیان نہیں رہا اور وہ آپ کی یادداشت کے ذخیرے میں گہری اڑ گئی ہے اور اب یاد نہیں آتی، لیکن کسی روز اُس کی طرف کوئی ہلکا سا اشارہ ملے ہی آپ کو وہ پوری بات یاد آ جاتی ہے۔ جیسے آپ کا کوئی دوست تھا، کسی زمانے میں بے تکلفی تھی، صبح شام ملا کا تہیں تھیں، اب طویل عرصہ ہو گیا، کبھی اس کی یاد نہیں آتی۔ ایسا نہیں کہ آپ کو یاد نہیں رہا، بلکہ ذہول ہے، نسیان ہے، توجہ ادھر نہیں ہے، کبھی ذہن ادھر منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اچانک کسی روز آپ نے اپنا ٹریک کھولا اور اس میں سے کوئی قلم یا روٹاں جو اُس نے کبھی دیا ہو یا آدہ ہو گیا تو فوراً آپ کو اپنا وہ دوست یاد آ جاتے گا۔ یہ phenomenon تذکرہ ہے۔ تذکرہ کا مطلب تعلیم نہیں ہے، تعلیم حاصل کرنا یعنی نئی بات جانتا ہے، بجز تذکرہ پہلے سے حاصل

شدہ علم جس پر ذہول اور نسیان کے جو پردے پڑ گئے تھے ان کو ہٹا کر اندر سے اسے برآمد کرنا ہے۔ فطرت انسانی کے اندر اللہ کی محبت اللہ کی معرفت کے حقائق مضمحل ہیں۔ یہ فطرت میں موجود ہیں، صرف ان پر پردے پڑ گئے ہیں دنیا کی محبت غالب آ گئی ہے۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے! (فیض)

یہاں کی دلچسپیوں، مسائل، مشکلات، مصروفیات، مشاغل کی وجہ سے ذہول ہو گیا ہے، پردہ پڑ گیا ہے۔ تذکر یہ ہے کہ اس پردے کو ہٹا دیا جائے۔

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی

آؤ سجدے میں گرین، لوحِ جبین تازہ کریں! (حافظ)

یادداشت کو recall کرنا اور اپنی فطرت میں مضمحل حقائق کو اجاگر کر لینا تذکر

ہے۔ قرآن کا اصل ہدف یہی ہے اور اس اعتبار سے قرآن کا دعویٰ سورۃ القمر میں چار

مرتبہ آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ﴾ ”ہم نے قرآن کو

تذکر کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے، تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟“ اس کے

لیے بہت گہرائی میں غوطہ زنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بہت مشقت و محنت مطلوب

نہیں ہے۔ انسان کے اندر طلبِ حقیقت ہو اور قرآن سے براہِ راست رابطہ

(Communication) ہو جائے تو تذکر حاصل ہو جائے گا۔ اس کی شرط صرف

ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اتنی عربی ضرور آتی ہو کہ وہ قرآن سے ہم کلام ہو

جائے۔ اگر آپ ترجمہ دیکھیں گے تو کچھ معلومات تو حاصل ہوں گی، تذکر نہیں ہو گا۔

اقبال نے کہا تھا:۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشف!

تذکر کے عمل کا اثر تو یہ ہے کہ آپ کے اندر کے مضمحل حقائق ابھر کر آپ کے شعور کی سطح

دوبارہ آجائیں۔ یہ نہ ہو کہ پہلے آپ نے متن کو پڑھا، پھر ترجمہ دیکھا، حاشیہ دیکھا، اس کے بعد اگلی آیت کی طرف گئے تو تسلسل ٹوٹ گیا اور کلام کی تاثر ختم ہوگئی۔ ترجمہ سے کلام کی اصل تاثر باقی نہیں رہتی۔ ٹیکسچر کی کوئی عبارت آپ انگریزی میں پڑھیں گے تو جھوم جائیں گے، اگر اس کا ترجمہ کریں گے تو اس کا وہ اثر نہیں ہوگا۔ اسی طرح غالب کا شعر ہو یا میر کا، اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے تو وہ اثر باقی نہیں رہے گا اور آپ وجد میں نہیں آئیں گے، جھوم جھوم نہیں جائیں گے۔ عربی زبان کا اتنا علم کہ آپ عربی متن کو براہ راست سمجھ سکیں، تذکر کی بنیادی شرط ہے۔ چنانچہ اولاً حسن نیت ہو، طلب ہدایت ہو، تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو، اور ثانیاً عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ آپ براہ راست اس سے ہم کلام ہو رہے ہوں، یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو تذکر ہو جائے گا۔

دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ آیت کا مطلب نشانی ہے۔ نشانی اسے کہتے ہیں جس کو دیکھ کر ذہن کسی اور شے کی طرف منتقل ہو جائے۔ آپ نے قلم یا رومال دیکھا تو ذہن دوست کی طرف منتقل ہو گیا جس سے طے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور اس کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مولانا روم کہتے ہیں۔

خنگ تار و خنگ مغز و خنگ پوست

از کجای آید این آواز دوست؟

ہمارا ایک ازلی دوست ہے "اللہ" وہی ہمارا خالق ہے، ہمارا باری ہے، ہمارا رب ہے۔ اس کی دوستی پر کچھ پردے پڑ گئے ہیں، اس پر کچھ ذہول طاری ہو گیا ہے۔ قرآن اس دوست کی یاد دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس کے برعکس تدبر گہرائی میں غوطہ زن ہونے کو کہتے ہیں۔ "ع" قرآن میں ہو غوطہ زن اسے مرد مسلمان! "تدبر کے اعتبار سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ اس کا منبع اور سرچشمہ علم الہی ہے اور علم الہی لامتناہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کلام میں حکم کی ساری صفات موجود ہوتی ہیں، لہذا یہ کلام لامتناہی ہے۔

اس کو کوئی شخص نہ عبور کر سکتا ہے نہ گہرائی میں اس کی تہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے، چاہے پوری پوری زندگیاں کھالیں۔ وہ چاہے صاحب کشف ہوں، صاحب تفسیر کبیر ہوں، کسے باشد۔ اس کا احاطہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ بعض لوگ غیر محتاط انداز میں یہ الفاظ استعمال کر دیتے ہیں کہ ”انہیں قرآن پر بڑا عبور حاصل ہے۔“ یہ قرآن کے لیے بڑا تو بہن آئینہ نظر ہے۔ عبور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ قرآن کا تو کنارہ ہی کوئی نہیں ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قرآن پر عبور حاصل کرے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح اس کی گہرائی تک پہنچ جانا بھی ناممکن ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تشبیہ سے بات کی قدر واضح ہو جائے گی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر میں کوئی ٹینکر تیل لے کر جا رہا ہے اور کسی وجہ سے اچانک تیل ٹپک کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن وہ تیل سطح سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے، نیچے نہیں جا پاتا۔ سطح سمندر پر اور تیل کی تہ اور نیچے پانی ہوتا ہے اور وہ تیل پانچ دس میل تک پھیل جاتا ہے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائی کے باوجود تیل سطح آب پر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید کی اصل ہدایت اور اصل تذکر اس کی سطح پر موجود ہے۔ اس تک رسائی کے لیے سائنس دان یا فلسفی ہونا، عربی ادب کا ماہر ہونا، کلام جاہلی کا عالم ہونا ضروری نہیں۔ صرف دو چیزیں موجود ہوں۔ پہلی خلوص نیت اور طلب ہدایت، دوسری قرآن سے براہ راست ہم کلامی کا شرف اور اس کی صلاحیت۔ یہ دونوں ہیں تو تمہارا کلام غصا پھرا ہو جائے گا۔ البتہ تدبیر کے لیے گہرائی میں اترا تا ہوگا اور اس بحر زخار میں غوطہ خانی کرنا ہوگی۔ تدبیر کا حق ادا کرنے کے لیے شعر جاہلی کو بھی جانا ضروری ہے۔ یہ لفظ کی بیجاں ضروری ہے کہ جس دور میں قرآن نازل ہوا اس زمانے اور اس علاقے کے لوگوں میں اس لفظ کا مفہوم کیا تھا، یہ کن معانی میں استعمال ہو رہا تھا۔ قرآن نے ہنر وادی اصطلاحات و دہن سے اخذ کی ہیں۔ وہی الفاظ جن کو عرب اپنے اشعار اور خطبات کے اندر استعمال کرتے تھے انہی کو قرآن مجید نے لیا ہے۔ چنانچہ نزول قرآن کے دور کی زبان کو سمجھنا اور اس

کے لیے ضروری مہارت کا ہونا تدبر کے لیے ناگزیر ہے۔ پھر یہ کہ احادیث 'علم بیان' منطق' ان سب کو انسان بطریق تدبر جانے گا تو پھر وہ اس کا حق ادا کر سکے گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر کا نام ہی "تدبر قرآن" رکھا ہے اور وہ تدبر قرآن کے بہت بڑے داعی ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ ان کے بعض شاگرد حضرات نے بھی محنتیں کی ہیں اور وقت لگایا ہے۔ اس کے ان تقاضوں کو تو ان حضرات نے بیان کیا ہے، لیکن تدبر قرآن کا ایک اور تقاضا بھی ہے جو بد قسمتی سے ان کے سامنے بھی نہیں آیا۔ اگر وہ تقاضا بھی پورا نہیں ہوگا تو عصر حاضر کے تدبر کا حق ادا نہیں ہوگا۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ علم انسانی آج جس لیول تک پہنچ گیا ہے، میٹریل سائنسز کے مختلف علوم کے ضمن میں جو کچھ معلومات انسان کو حاصل ہو چکی ہیں اور وہ خیالات و نظریات جن کو آج دنیا میں مانا جا رہا ہے ان سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اگر ان کا اجمالی علم نہیں ہے تو اس دور کے تدبر قرآن کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن حکیم وہ کتاب ہے جو ہر دور کے آفتی پر خورشید تازہ کی مانند طلوع ہوگی۔ آج سے سو برس پہلے کے قرآن اور آج کے قرآن میں اس حوالے سے فرق ہوگا۔ متن اور الفاظ وہی ہیں، لیکن آج علم انسانی کی جو سطح ہے اس پر اس قرآن کے فہم اور اس کے علم کو جس طریقے سے جلوہ گر ہونا چاہیے اگر آپ اس کا حق ادا نہیں کر رہے تو آپ سو برس پہلے کا قرآن پڑھا رہے ہیں، آج کا قرآن نہیں پڑھا رہے۔ جیسے اللہ کی شان ہے ﴿كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

اسی طرح ہدایت عملی کے ضمن میں اقتصادیات، سماجیات اور نفسیات انسانی کے سلسلہ میں راہنمائی اور حقائق قرآن میں موجود ہیں، انہیں کیسے سمجھیں گے؟ قرآن کی اصل تعلیمات کی قدر و قیمت اور اس کی اصل evaluation کیسے ممکن ہے اگر انسان آج کے اقتصادی مسائل کو نہ جانتا ہو؟ اس کے بغیر وہ تدبر قرآن کا حق نہیں ادا کر سکتا۔ مثلاً آج کے اقتصادی مسائل کیا ہیں؟ پیچہ کرنسی کی حقیقت کیا ہے؟

اقتصادیات کے اصول و مبادی کیا ہیں؟ بینکنگ کی اصل بنیاد کیا ہے؟ کس طرح کچھ لوگوں نے اس پوری نوع انسانی کو معاشی اعتبار سے بے بس کیا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو جب تک نہیں سمجھیں گے تو آج کے دور میں قرآن حکیم کی اقتصادی تعلیمات واضح کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تدبر قرآن کسی ایک انسان کے بس کا روگ ہی نہیں رہا اس کے لیے تو ایک جماعت درکار ہے۔ میرے کتابچے ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ کے باب ”تذکرہ تدبر“ میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ ایسی یونیورسٹیز قائم ہوں جن کا اصل مرکزی شعبہ ”تدبر قرآن“ کا ہو۔ جو شخص بھی اس یونیورسٹی کا طالب علم ہو وہ عربی زبان سیکھے اور قرآن پڑھے۔ لیکن اس مرکزی شعبے کے گرد تمام علوم عقلی جیسے منطق، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، نفسیات اور الہیات، علوم عمرانی جیسے معاشیات، سیاسیات اور قانون، اور علوم طبعی جیسے ریاضی، کیمیا، طبیعیات، ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو اور ہر ایک طالب علم ”تدبر قرآن“ کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو حقیقی طور پر اخذ کر کے موثر انداز میں پیش کر سکے۔ طالب علم وہ بھی پڑھے جب معلوم ہوگا کہ اس شعبے میں انسان آج کہاں کھڑا ہے اور قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ فلاں شعبے میں نوع انسانی کے کیا مسائل ہیں اور اس ضمن میں قرآن حکیم کیا کہتا ہے۔ مختلف شعبے ل کر تدبر قرآن کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، تذکرے اعتبار سے قرآن آسان ترین کتاب ہے جو ہماری فطرت کی بیکار ہے۔ ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں تھا!“ اگر انسان کی فطرت مسخ شدہ نہیں ہے بلکہ سلیم ہے صالح ہے سلامتی پر قائم ہے تو وہ قرآن کو اپنے دل کی بیکار محسوس کرے گا اس کے اور قرآن کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا وہ اسے اپنے دل کی بات سمجھے گا اس کے لیے عربی زبان کا صرف اتنا علم کافی ہے کہ براہ

راست ہم کلام ہو جائے۔ جبکہ تدبر کے تقاضے پورے کرنے کسی ایک انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس میدان میں قدم رکھنا چاہے اس کے ذہن میں ایک اجمالی خاکہ ضرور ہونا چاہیے کہ آج جدید سائنسز کے اعتبار سے انسان کہاں کھڑا ہے۔ جب انسان کو اپنے مقام کی معرفت حاصل ہو جائے تو وہ قرآن مجید سے بہتر طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ سمندر میں تو بے تحاشا پانی ہے آپ اگر پانی لینا چاہتے ہیں تو جتنا بڑا کنورا کوئی دیگ، دنگھی یا بالٹی آپ کے پاس ہے اسی کو آپ بھر لیں گے۔ یعنی جتنا آپ کا ظرف ہوگا اتنا ہی آپ سمندر سے پانی اخذ کر سکیں گے۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہ ہوگا کہ سمندر میں پانی ہی اتنا ہے! انسانی ذہن کا ظرف علوم سے بنتا ہے۔ یہ ظرف آج سے پہلے بہت تنگ تھا۔ ایک ہزار سال پہلے کا ظرف ذہنی بہت محدود تھا۔ انسانی علوم کے اعتبار سے آج کا ظرف بہت وسیع ہے۔ اگر آج آپ کو قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنی ہے تو آپ کو اپنا ظرف اس کے مطابق وسیع کرنا ہوگا۔ اور اگر کچھ لوگ ابھی اسی سابق دور میں رہ رہے ہیں تو قرآن حکیم کے حقیقی حقائق ان پر منکشف نہیں ہوں گے۔

(۶) عملی ہدایات اور مظاہر طبیعی کے بارے میں متضاد طرزِ عمل

قرآن حکیم میں سائنسی علوم کے جو حوالہ جات آتے ہیں اور اس میں جو عملی ہدایات ملتی ہیں ان کے ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک اعتبار سے ہمیں آگے سے آگے بڑھنا ہے اور دوسرے اعتبار سے ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے والے کا انداز (attitude) دو اعتبارات سے بالکل متضاد ہونا چاہیے۔ سائنسی حوالہ جات جو قرآن میں آئے ہیں ان کی تعبیر کرنے میں آگے سے آگے جائیے۔ آج انسان کو کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں، کون سے حقائق پانچ شہوت کو بخنجر چکے ہیں، ان کے حوالے پیش نظر رہیں گے۔ اس میں پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام رازی اور دیگر قدیم مفسرین کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے بھی کچھ فرمایا ہے تو وہ بھی ہمارے لیے لازم نہیں

ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ سائنس اور ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ تاہم نخل کا واقعہ پیچھے گزر چکا ہے اس کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((انتم أعلم بأمیر دنیاکم)) ”اپنے دنیاوی معاملات کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔“ تجرباتی علوم کے مطابق جو تمہیں علم حاصل ہے اس پر عمل کرو۔ لیکن دین کا جو عملی پہلو ہے اس میں پیچھے سے پیچھے جائیے۔ یہاں یہ دلیل نہیں چلے گی کہ جدید دور کے تقاضے کچھ اور ہیں جبکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور آپ کے صحابہ کرام نے کیا کیا۔ اس حوالے سے قرآن کے طالب علم کا رخ پیچھے کی طرف ہونا چاہیے کہ اسلاف نے کیا سیکھا۔ متاخرین کو چھوڑ کر حقد میں کی طرف جائیے۔ حقد میں سے تیج تابعین پھر تابعین سے ہوتے ہوئے ”مَا آتَانَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي“ یعنی حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے عمل تک پہنچئے۔ اس اعتبار سے اقبال کا یہ شعر صحیح منطبق ہوتا ہے۔

بمصطفیٰ برسوں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باد زسیدی تمام بولھی ست!

دین کا عملی پہلو وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اس میں اگرچہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے کچھ فرق ہو جائے گا مگر دلیل یہی رہے گی: ((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)) ”نماز اس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔“ اب نماز کی جزئیات کے بارے میں روایات میں کچھ فرق ملتا ہے۔ کسی کے نزدیک ایک روایت قابل ترجیح ہے کسی کے نزدیک دوسری۔ اس اعتبار سے جزئیات میں تھوڑا بہت فرق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ دلیل یہی رہے گی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کرام کا عمل یہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی ٹوٹ کر لیجئے: ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهَلِّبِينَ)) ”تم پر میری سنت اختیار کرنا لازم ہے اور میرے خلفاء راشدین کی سنت جو ہدایت یافتہ ہیں۔“ چنانچہ حضور ﷺ کا عمل اور خلفاء راشدین کا عمل ہمارے لیے لائق تقلید ہے۔ پھر اسی سے متصل وہ چیزیں ہیں جن پر ہماری چودہ سو برس کی تاریخ میں امت کا اجماع رہا ہے۔

اب دنیا اسلامی سزاؤں کو وحیاً نہ قرار دے کر ہم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور ہمیں بنیاد پرست (Fundamentalist) کی گالی دے کر چاہتی ہے کہ ہمارے اندر معذرت خواہانہ رویہ پیدا کر دے، مگر ہمارا طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ ان باتوں سے قطعاً متاثر ہوئے بغیر دین کے عملی پہلو کے بارے میں پیچھے سے پیچھے جاتے ہوئے ﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ تک پہنچ جائیں!

بد قسمتی سے ہمارے عام علماء کا حال یہ ہے کہ انہوں نے عربی علوم تو پڑھے ہیں، عربی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں، مگر وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ انہوں نے سائنس نہیں پڑھی، وہ جدید علوم سے واقف نہیں، وہ نہیں جانتے آئن سٹائن کس بلا کا نام ہے اور اس شخص کے ذریعے طبیعیات کے اندر کتنی بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ نیوٹونن ایرا کیا تھا اور آئن سٹائن کا دور کیا ہے، انہیں کیا پتہ! آج کائنات کا تصور کیا ہے، ایٹم کی ساخت کیا ہے، انہیں کیا معلوم! ایٹم تو پرانی بات ہو گئی، اب تو انسان نیوٹرون پروٹون سے بھی کہیں آگے کی باریکیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ان چیزوں کو نہیں جانیں گے تو ان حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہوگا۔ مظاہر طبیعی کا معاملہ تو آگے سے آگے جا رہا ہے۔ اس کی تعبیر جدید سے جدید ہونی چاہیے۔ البتہ اس ضمن میں یہ فرق ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک تو سائنس کے میدان کے محض نظریات (theories) ہیں جنہیں مسلمہ حقائق کا درجہ حاصل نہیں ہے، جبکہ ایک وہ چیزیں ہیں جن کی تجرباتی توثیق ہو چکی ہے اور انہیں اب مسلمہ حقائق کا درجہ حاصل ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا ہوگا۔ خواہ مخواہ کوئی بھی نظریہ سامنے آ جائے یا کوئی مفروضہ (hypothesis) منظر عام پر آ جائے اس پر قرآن کو منطبق کرنے کی کوشش کرنا سعی لا حاصل بلکہ مضر شے ہے۔ لیکن اصولی طور پر ہمیں ان چیزوں کی تعبیر میں آگے سے آگے بڑھنا ہے۔ اور جہاں تک دین کے عملی حصے کا تعلق ہے جسے ہم شریعت کہتے ہیں، یعنی اوامر و نواہی، حلال و حرام، حدود و تعزیرات وغیرہ، ان تمام معاملات میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہوگا، یہاں تک کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں اپنے

آپ کو پہنچا دیجیے۔ اس لیے کہ دین اسی کا نام ہے۔
 بمصطفیٰ برسوں خویش را کہ دین ہمہ اوست
۷) فہم قرآن کے لیے جذبہ انقلاب کی ضرورت

فہم قرآن کے لیے بنیادی اصول اور بنیادی ہدایات یا اشارات کے ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے تفہیم القرآن کے مقدمے میں کہی ہے کہ قرآن محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ کسی ڈرائنگ روم میں یا کتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ کوئی محقق یا ریسرچ سکلرڈ کسٹریوں اور تفسیروں کی مدد سے اسے سمجھنا چاہے تو نہیں سمجھ سکے گا۔ اس لیے کہ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

”..... اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دین اور معرکہ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں! اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں.....“

قرآن مجید کی بہت سی بڑی اہم حقیقتیں اس کے بغیر منکشف نہیں ہوں گی اس لیے کہ قرآن ایک ”کتاب انقلاب“ (Manual of Revolution) ہے۔ اس قرآن نے انسانی جدوجہد کے ذریعے عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی جو اللہ ایک حزب اللہ تھے، ایک جماعت اور ایک پارٹی تھے انہوں نے دعوت اور انقلاب کے تمام مراحل کو طے کیا اور ہر مرحلے پر اس کی مناسبت سے ہدایات نازل ہوئیں۔ ایک مرحلہ وہ بھی تھا کہ حکم دیا جا رہا تھا کہ مار کھاؤ لیکن ہاتھ مت

اِثَاو۔ ﴿كُلُّوْا اَيْدِيَكُمْ﴾۔ پھر ایک مرحلہ وہ بھی آیا کہ حکم دے دیا گیا کہ اب آگے بڑھو اور جواب دو انہیں قتل کرو۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةً وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۳۹) ”اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین گل کا گل اللہ کے لیے ہو جائے“۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَاَقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ لَقِيتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ”اور ان کو قتل کر دو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے“۔

دونوں مراحل میں یقیناً فرق ہے بلکہ بظاہر تضاد ہے لیکن جاننا چاہیے کہ یہ ایک ہی جدوجہد کے دو مختلف مراحل ہیں۔ پھر ایک داعی جب دعوت دیتا ہے تو جو مسائل اسے درپیش ہوتے ہیں ان کو ایک ایسا شخص قطعاً نہیں جان سکتا جس نے اُس کو بچے میں قدم ہی نہیں رکھا ہے۔ اسے کیا احساس ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے یہ کیوں کہا جا رہا ہے: ﴿اِنَّ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿۱﴾ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾ وَاِنَّ لَكَ لَآخِرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴿۳﴾﴾ ”قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں! آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور آپ کے لیے تو بے انتہا اجر ہے“۔ یعنی اے نبی آپ محزون اور غمگین نہ ہوں۔ آپ ان کے کہنے سے (معاذ اللہ) مجنون تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے الفاظ جب کسی کو کہے جاتے ہیں تو اس کا ہی دل جانتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ قریش مکہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر قلب محمدی پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔ یہ قرآن ہم پر reveal نہیں ہو سکتا جب تک ان احساسات و کیفیات کے ساتھ ہم خود دو چار نہ ہوں۔ جب تک کہ ہماری کیفیات و احساسات اس کے ساتھ مماثلت نہ رکھیں ہم کیسے سمجھیں گے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کس کیفیت کے اندر کہا جا رہا ہے۔

میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے طلبہ سب سے پہلے جس کتاب سے متعارف ہوتے ہیں وہ ”Manual of Dissection“ ہے۔ اس میں ہدایات

ہوتی ہیں کہ لاش کے بدن پر یہاں شکاف لگاؤ اور کھال ہٹاؤ تو تمہیں یہ چیز نظر آئے گی، یہاں شکاف لگاؤ تو تمہیں فلاں شے نظر آئے گی، اسے یہاں سے ہٹاؤ گے تو تمہیں اس کے پیچھے فلاں چیز چھپی ہوئی نظر آئے گی۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم "Manual of Revolution" ہے۔ جب تک کوئی شخص انقلابی جدوجہد میں شریک نہیں ہوگا قرآن حکیم کے معارف کا بہت بڑا خزانہ اُس کے لیے بند رہے گا۔ ایک شخص فقیہ ہے مفتی ہے تو وہ فقہی احکام کو ضرور اس کے اندر سے نکال لے گا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض تفاسیر "احکام القرآن" کے نام سے لکھی گئی ہیں جن میں صرف ان ہی آیات کے بارے میں گفتگو اور بحث ہے جن سے کوئی نہ کوئی فقہی حکم مستنبط ہوتا ہے۔ مثلاً حلت و حرمت کا حکم، کسی شے کے فرض ہونے کا حکم جس سے عمل کا معاملہ متعلق ہے۔ باقی تو گویا قصص ہیں، تاریخی حقائق و واقعات ہیں۔ یہاں تک کہ قصہ آدم و ابلیس جو سات مرتبہ قرآن میں آیا ہے یا ایمانی حقائق کے لیے جو دلائل و براہین ہیں ان سے کوئی گفتگو نہیں کی گئی، بلکہ صرف احکام القرآن جو قرآن کا ایک حصہ ہے اسی کو اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن کے تدریجاً نزول کا سبب یہ ہے کہ صاحب قرآن ﷺ کی جدوجہد کے مختلف مراحل کو سمجھا جائے، ورنہ فقہی احکام تو مرتب کر کے دیے جاسکتے تھے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیے گئے تھے۔ "احکام عشرہ" تختیوں پر کندہ تھے جو موسیٰ کے سپرد کر دیے گئے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد جس جس مرحلے سے گزرتی رہی قرآن میں اس مرحلے سے متعلق آیات نازل ہوتی رہیں۔ تزیل کی ترتیب کے اندر مضمراصل حکمت یہی تو ہے کہ آنحضرت ﷺ کی جدوجہد حرکت اور دعوت کے مختلف مراحل سامنے آجاتے ہیں۔ اب بھی قرآن کی بنیاد پر اور منہج انقلاب نبوی پر جو جدوجہد ہوگی اسے ان تمام مراحل سے ہو کر گزرنا ہوگا۔ چنانچہ کم سے کم یہ تو ہو کہ اس جدوجہد کو علمی طور پر فہم کے لیے انسان سامنے رکھے۔ اگر علمی اعتبار سے سیرت النبیؐ کا خاکہ ذہن میں موجود نہ ہو تو فہم کسی درجے میں بھی حاصل نہیں ہوگا۔ فہم حقیقی تو اسی وقت حاصل ہوگا جب آپ خود اس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور وہی

مسائل آپ کو پیش آرہے ہیں تو اب معلوم ہوگا کہ یہ مقام اور مرحلہ یا مسئلہ وہ تھا جس کے لیے یہ ہدایت قرآنی آئی تھی۔

(۸) قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت

اس ضمن میں یہ جانتا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ یاد رکھیے کہ ثبوت دو قسم کے ہوتے ہیں: خارجی اور داخلی۔ خارجی ثبوت خود محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ یہ کلام مجھ پر نازل ہوا۔ پھر آپ ﷺ کی شہادت بھی دو حیثیتوں سے ہے۔ آپ ﷺ کی شخصاً شہادت زیادہ نمایاں اُس وقت تھی جب کہ قرآن نازل ہوا اور حضور ﷺ خود موجود تھے۔ وہ لوگ بھی وہاں موجود تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی چالیس سالہ زندگی کا مشاہدہ کیا تھا، جنہیں کاروباری شخصیت کی حیثیت سے آپ ﷺ کے معاملات کا تجربہ تھا۔ جن کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت، دیانت، امانت اور ایفائے عہد کا پورا نقشہ موجود تھا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن کے سامنے چہرہ محمدی موجود تھا۔ سلیم الفطرت انسان آپ ﷺ کا روئے انور دیکھ کر پکار اٹھتا تھا کہ سُبْحَانَ اللَّهِ مَا هَذَا بَوْجِهٍ كَذَّابٍ (اللہ پاک ہے یہ چہرہ کسی جھوٹے کا ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو حضور ﷺ کی شخصیت آپ کی ذات اور آپ کی شہادت کہ یہ قرآن مجھ پر نازل ہوا سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اس اعتبار سے یاد رکھیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن باہم ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن محمد ﷺ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے: ﴿يَسِّرْهُ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ﴾ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿﴾ قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت ذات محمدی ہے۔ اس کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت رسول اللہ ﷺ کی ذات، آپ کی شخصیت، آپ کی سیرت و کردار، آپ کا اخلاق، آپ کا وجود، آپ کی شبیہ اور چہرہ سامنے تھا۔ دوسرا پہلو جو دائمی ہے اور آج بھی ہے وہ حضور ﷺ کا وہ کارنامہ ہے جو تاریخ کی ان مٹ شہادت ہے۔ آپ اچھی و بلیز، ایم این رائے یا ڈاکٹر مائیکل ہارٹ سے پوچھیں کہ وہ

کتنا عظیم کارنامہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا۔ اور آپ خود کہہ رہے ہیں کہ میرا آلہ انقلاب قرآن ہے، یہی میرا اسلحہ اور اصل طاقت ہے، یہی میری قوت کا سرچشمہ اور میری تاثیر کا منبع ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی؟ یہ تو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی خارجی شہادت ہے۔ یعنی ”حضور کی شخصیت“۔ شہادت کا یہ پہلو حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں اور آپ ﷺ کی حیات دنیاوی کے دوران زیادہ نمایاں تھا۔ اور جہاں تک آپ کے کارنامے کا تعلق ہے اس پر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دیکھیے مائیکل ہارٹ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یعنی تاریخ انسانی میں صرف وہی واحد شخص ہیں جو سیکولر اور مذہبی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب رہے۔ اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو خارجی ثبوت گویا تمام وکمال حاصل ہو گیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ انسان کا دل گواہی دے۔ داخلی ثبوت انسان کا اپنا باطنی تجربہ ہوتا ہے۔ اگر ہزار آدمی کہیں چینی میٹھی سے مگر آپ نے نہ چکھی ہو تو آپ کہیں گے کہ جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں میٹھی ہے تو ہوگی میٹھی۔ ظاہر ہے ایک ہزار آدمی مجھے کیوں دھوکہ دینا چاہیں گے یقیناً میٹھی ہوگی۔ لیکن ”ہوگی“ سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ البتہ جب انسان چینی کو چکھ لے اور اس کی اپنی حس ذائقہ بتا رہی ہو کہ یہ میٹھی ہے تو اب ”ہوگی“ نہیں ”ہے“۔ ”ہوگی“ اور ”ہے“ میں درحقیقت انسان کے ذاتی تجربے کا فرق ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج کی دنیا صرف خارجی تجربات کو جانتی ہے۔ ایک تجربہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہے اور وہ باطنی تجربہ ہے یعنی کسی شے پر آپ کا دل گواہی دے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا

لغبت غریب، جب تک تیرا دل نہ دے گواہی!

لا الہ الا اللہ کے لیے اگر دل نے گواہی نہ دی تو انسان خواہ عربی النسل ہو عربی زبان

جانتا ہو، لیکن اس کے لیے یہ کلمہ لغتِ غریب ہی ہے، تا مانوس ہی بات ہے اس کے اندر پیوست نہیں ہے اس کو متاثر نہیں کرتی۔ قرآن انسان کی اپنی فطرت کو اپیل کرتا ہے اور انسان کو اپنے من میں جھانکنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے من میں جھانکو دیکھو تو سہی غور تو کرو: **إِنَّمَا إِلَهُ اللَّهِ شَكُّ فَأَطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ **إِنِّي لَأَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهَةً أُخْرَى**؟ کیا تم واقعتاً یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں ہے!

علامہ ابن قیمؒ نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ مصحف سے نہیں پڑھ رہے بلکہ قرآن اُن کے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے، وہاں سے پڑھ رہے ہیں۔ گویا فطرتِ انسانی کو قرآن مجید کے ساتھ اتنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔

ہمارے دور کے ایک صوفی بزرگ کہا کرتے ہیں کہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ جیسے ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور باہم نسبت محسوس کرتے ہیں ایسا ہی معاملہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم کا ہے۔ قرآن کو پڑھ کر اور سن کر روحِ انسانی محسوس کرتی ہے کہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرا ہے۔ جہاں سے میں آئی ہوں یہ کلام بھی وہیں سے آیا ہے۔ یقیناً اس کلام کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرے وجودِ میری ہستی اور میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ ہم آہنگی ہے جو اصل باطنی تجربہ بن جائے تب ہی یقین ہوتا ہے کہ یہ کلام واقعتاً اللہ کا ہے۔

عجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ

قرآن اور صاحبِ قرآن کا باہمی تعلق

میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ دونوں ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے معتبر خارجی گواہی نبی اکرم ﷺ کی اپنی گواہی ہے۔ آپ کی شخصیت آپ کا کردار آپ کا چہرہ انور اپنی اپنی جگہ پر گواہ ہیں۔ ہمارے لیے اگرچہ آپ ﷺ کی سیرت آج بھی زندہ و پائندہ ہے، کتابوں میں درج ہے، لیکن ایک مجسم انسانی شخصیت کی صورت میں آپ ﷺ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں، ہم آپ ﷺ کے روئے انور کی زیارت سے محروم ہیں۔ تاہم آپ ﷺ کا کارنامہ زندہ و تابندہ ہے اور اس کی گواہی ہر شخص دے رہا ہے۔ ہر مورخ نے تسلیم کیا ہے، ہر مفکر نے مانا ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ تھا جو حضور ﷺ نے برپا کیا۔ آپ کی یہ عظمت آج بھی مبرہن ہے، آشکارا ہے، اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ قرآن کے منزل من اللہ اور کلام الہی ہونے پر سب سے بڑی خارجی گواہی خود نبی اکرم ﷺ ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے نبی اور رسول ہونے کا سب سے بڑا گواہ سب سے بڑا شاہد اور سب سے بڑا ثبوت خود قرآن مجید ہے۔

اس اعتبار سے یہ دونوں جس طرح لازم و ملزوم ہیں اس کے لیے میں قرآن حکیم کے دو مقامات سے استشہاد کر رہا ہوں۔ سورۃ البینہ میں فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفِكِينَ حَتَّى تَنْهَاهُمُ الْبَيْتَةَ﴾

”اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اور مشرک باز آنے والے نہ تھے

یہاں تک کہ اُن کے پاس 'پینہ' آ جاتی۔"

"پینہ" کھلی اور روشن دلیل کو کہتے ہیں۔ ایسی بالکل روشن حقیقت جس کو کسی خارجی دلیل کی مزید حاجت نہ ہو وہ "پینہ" ہے۔ جیسے ہم اپنی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل نین ہے بالکل واضح ہے اس پر کسی قیل و قال کی حاجت ہی نہیں ہے۔ بلکہ اگر پینہ پر کوئی دلیل لانے کی کوشش کی جائے تو کسی درجے میں شک و شبہ تو پیدا کیا جاسکتا ہے اس پر یقین میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ پینہ کیا ہے؟ فرمایا:

(رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴿١﴾ فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ ﴿٢﴾)

"ایک رسول اللہ کی جانب سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سنا تا ہے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔"

یہاں قرآن حکیم کی سورتوں کو اللہ کی کتابوں سے تعبیر کیا گیا ہے جو قائم و دائم ہیں اور ہمیشہ ہمیش رہنے والی ہیں۔ تو گو یا رسول کی شخصیت اور اللہ کا یہ کلام جو اُن پر نازل ہوا دونوں مل کر "پینہ" بنتے ہیں۔

میں نے قرآن مجہی کا یہ اصول بارہا عرض کیا ہے کہ قرآن مجہد میں اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ اس کی نظیر سورۃ الطلاق میں موجود ہے۔ اس کی آیت ۱۰ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: (لَقَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿١﴾) "اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے۔" اور یہ ذکر کیا ہے؟ فرمایا: (رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُمِيسَاتٍ لِّيُخْرِجَ الْإِنسَانَ أَعْمَلُوا وَعَمِلُوا الْعَالَمَاتِ مِنَ الظَّالِمَاتِ إِلَى التَّوْبَةِ ﴿٢﴾) "ایک ایسا رسول جو تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے اللہ کی آیات جو ہر شے کو روشن کر دینے والی (اور ہر حقیقت کو میرہن کر دینے والی) ہیں تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تارکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔" یہاں "آیت مُمِيسَاتٍ" کے بجائے "آیت مُمِيسَاتٍ" آیا ہے۔ "نین" وہ چیز ہے جو خود روشن ہے اور "مُمِيسَاتٍ" وہ چیز ہے جو دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہے حقائق کو اجاگر کرتی ہے۔ تو یہاں پڑ کر کی جو تاویل کی گئی کہ (رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُمِيسَاتٍ) اس سے

واضح ہوا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے اور ملے ہوئے ہیں کہ ایک حیاتیاتی وجود (Organic Whole) بن گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے شاہد بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے complimentary بھی ہیں۔ اس حوالے سے یہ دونوں حقیقتیں اس طرح جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جاسکتیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم

اگلی بات یہ سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا بالفاظ دیگر آپ کا اصل معجزہ، بلکہ واحد معجزہ قرآن حکیم ہے۔ یہ بات ذرا اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ ”معجزہ“ کا لفظ ہمارے ہاں بہت عام ہو گیا ہے اور ہر خرق عادت شے کو معجزہ شمار کیا جاتا ہے۔ معجزہ کے لفظی معنی عاجز کر دینے والی شے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ”عجز“ مادہ سے بہت سے الفاظ آتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں اصطلاح کے طور پر اس لفظ کا جو اطلاق کیا جاتا ہے وہ قرآن حکیم میں مستعمل نہیں ہے، بلکہ اللہ کے رسولوں کو جو معجزات دیئے گئے انہیں بھی آیات کہا گیا ہے۔ انبیاء و رسل اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی اللہ کی نشانیاں لے کر آئے۔ اس اعتبار سے معجزہ کا لفظ جس معنی میں ہم استعمال کرتے ہیں اس معنی میں یہ قرآن مجید میں مستعمل نہیں ہے۔ البتہ وہ طبیعی قوانین (Physical Laws) جن کے مطابق یہ دنیا چل رہی ہے، اگر کسی موقع پر وہ ٹوٹ جائیں اور ان کے ٹوٹ جانے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی معجزہ ظاہر ہو تو اسے خرق عادت کہتے ہیں۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کی ضرب لگائی اور سمندر پھٹ گیا، یہ خرق عادت ہے، یعنی جو عادی قانون ہے وہ ٹوٹ گیا۔ ”خرق“ پھٹ جانے کو کہتے ہیں، جیسے سورۃ الکہف میں یہ لفظ آیا ہے ”خَرَقَهَا“ یعنی اس اللہ کے بندے نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے، کشتی میں شکاف ڈال دیا۔ پس جب بھی کوئی طبیعی قانون ٹوٹے گا تو وہ خرق عادت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان خرق عادت واقعات کے ذریعے سے بہت سے قوانین قدرت کو توڑ کر اپنی خصوصی

مشیت اور خصوصی قدرت کا اظہار فرماتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے ہاں مسلم ہے کہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے بھی جن کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا چاہے کرتا ہے لیکن اصطلاحاً ہم انہیں کرامات کہتے ہیں۔ خرق عادت یا کرامات اپنی جگہ پر ایک مستقل مضمون ہے۔

معجزہ بھی خرق عادت ہوتا ہے لیکن رسول کا معجزہ وہ ہوتا ہے جو دعوے کے ساتھ پیش کیا جائے اور جس میں تحدی (challenge) بھی موجود ہو۔ یعنی جسے رسول خود اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کرے اور پھر اس میں مقابلے کا چیلنج دیا جائے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو معجزات عطا کیے ان میں ”یَدِ بِيضَا“ اور ”عَصَا“ کی حیثیت اصل معجزے کی تھی۔ ویسے آیات اور بھی دی گئی تھیں جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ سَمْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾ ”اور بیشک ہم نے موسیٰ کو نوروشن نشانیاں دیں۔“ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ ابھی مصر کے اندر تھے۔ پھر جب آپ مصر سے باہر نکلے تو عصا کی کرامات ظاہر ہوئیں کہ اس کی ضرب سے سمندر پھٹ گیا اس کی ضرب سے چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ تمام چیزیں خرق عادت ہیں لیکن اصل معجزے دو تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ میری رسالت کا ثبوت ہے۔

جب آپ فرعون کے دربار میں پہنچے اور آپ نے اپنی رسالت کی دعوت پیش کی تو دلیل رسالت کے طور پر فرمایا کہ میں اس کے لیے سند (سُلْطَانٌ مُّبِينٌ) بھی لے کر آیا ہوں۔ فرعون نے کہا کہ لاؤ پیش کرو تو آپ نے یہ دو معجزے پیش کیے۔ یہ دو معجزے جو اللہ کی طرف سے آپ کو عطا کیے گئے آپ کی رسالت کی سند تھے۔ اس میں تحدی بھی تھی۔ لہذا مقابلہ بھی ہوا اور جادوگروں نے پہچان بھی لیا کہ یہ جادو نہیں ہے معجزہ ہے۔ معجزہ جس میدان کا ہوتا ہے اسے اسی میدان کے افراد ہی پہچان سکتے ہیں۔ جب جادوگروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو عام دیکھنے والوں نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور یہ چھوٹے جادوگر ہیں اس کا جادو زیادہ طاقتور نکلا اس کے

عصانے بھی سانپ اور اژدھا کی شکل اختیار کی تھی اور ان جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں نے بھی سانپوں کی شکل اختیار کر لی تھی البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کا بڑا سانپ باقی تمام سانپوں کو نگل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجمع ایمان نہیں لایا، لیکن جادوگر تو جانتے تھے کہ اُن کے فن کی رسائی کہاں تک ہے اس لیے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ جادو نہیں ہے، کچھ اور ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کا اصل احساس عرب کے شعراء، خطیبوں اور زبان دانوں کو ہوا تھا۔ عام آدمی نے بھی اگرچہ محسوس کیا کہ یہ خاص کلام ہے، بہت بڑا تاثیر اور بیٹھا کلام ہے، لیکن اس کا معجزہ ہونا یعنی عاجز کر دینے والا معاملہ تو اسی طرح ثابت ہوا کہ قرآن مجید میں بار بار چیلنج دیا گیا کہ اس جیسا کلام پیش کرو۔ اس اعتبار سے جان لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

آپ ﷺ کے خرق عادت معجزات تو بے شمار ہیں۔ حق قرآن حکیم سے ثابت ہے، لیکن یہ آپ ﷺ نے دعوے کے ساتھ نہیں دکھایا نہ ہی اس پر کسی کو چیلنج کیا، بلکہ آپ سے جو مطالبے کیے گئے تھے کہ آپ یہ یہ کر کے دکھائیے، اُن میں سے کوئی بات اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوئی۔ اللہ چاہتا تو اُن کا مطالبہ پورا کر دیتا، لیکن اُن مطالبوں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ البتہ خرق عادت واقعات بے شمار ہیں۔ جانوروں کا بھی آپ کی بات کو سمجھنا اور آپ سے عقیدت کا اظہار کرنا بہت مشہور ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ۶۳ اونٹوں کو حضور ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے نحر کیا تھا۔ قطار میں سواونٹ کھڑے کیے گئے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک اونٹ جب گرتا تھا تو اگا خود آگے آ جاتا تھا۔ اسی طرح ”ستونِ حنانہ“ کا معاملہ ہوا۔ حضور ﷺ مسجد نبوی میں کھجور کے ایک تنے کا سہارا لے کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، مگر جب اس مقصد کے لیے منبر بنا دیا گیا اور آپ پہلی مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے تو اُس سوکھے ہوئے تنے میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو، اسی لیے تو اسے ”حنانہ“ کہتے ہیں۔ ایسے ہی کئی مواقع پر تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کو کفایت کر گیا۔

ان خرق عادت واقعات کو بعض عقلیت پسند (Rationalists) اور سائنسی مزاج کے حامل لوگ تسلیم نہیں کرتے۔ پچھلے زمانے میں بھی لوگ ان کا انکار کرتے رہے ہیں۔ اس پر مولانا زوم نے خوب فرمایا ہے کہ:

فلسفی کو منکرِ حقانہ است
از حواسِ انبیا بیگانہ است!

بہر حال خرق عادت واقعات حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں بہت ہیں۔ (تفصیل دیکھنا ہو تو ”سیرت النبیؐ“ از مولانا شبلی کی ایک ضخیم جلد صرف حضور ﷺ کے خرق عادت واقعات پر مشتمل ہے) لیکن جیسا کہ اوپر گزرا، معجزہ دعوے کے ساتھ اور رسالت کے ثبوت کے طور پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آئی ہے کہ آپ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو میں مُردوں کو زندہ کر کے دکھا رہا ہوں۔ میں گارے سے پرندے کی صورت بناتا ہوں اور اُس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا ہے۔ خرق عادت کا معاملہ تو غیر نبی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے لیے بھی اس طرح کے حالات پیدا کر سکتا ہے۔ اُن کا اللہ کے ہاں جو مقام و مرتبہ ہے اس کے اظہار کے لیے کرامات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ یہ چیزیں بعید نہیں ہیں، لیکن انبیاء کی کرامات کو عرف عام میں ”معجزات“ کہا جاتا ہے اور غیر انبیاء اور اولیاء کے لیے ”کرامات“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معجزہ وہ ہے جسے اللہ کا رسول دعوے کے ساتھ پیش کرے اور چیلنج کرے۔

یہ بات کہ قرآن مجید ہی حضور ﷺ کا اصل معجزہ ہے دو اعتبارات سے قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ ایک مثبت انداز ہے جیسے سورہ یس کی ابتدائی آیات میں فرمایا:

﴿يَسَّ وَالْقُرْآنَ الْحَكِيمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝﴾ ”یس۔ حکم ہے قرآن حکیم کی (اور قسم کا اصل فائدہ شہادت ہوتا ہے یعنی گواہ ہے یہ قرآن حکیم) کہ یقیناً (اے محمد ﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں۔“ خطاب بظاہر حضور ﷺ سے ہے حالانکہ

حضور کو یہ بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ مخاطبین یعنی اہل عرب اور اہل مکہ کو سنایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن شاہد ہے یہ ثبوت ہے یہ دلیل قطعی ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں یہ قرآن پکار پکار کر محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کے چار مقامات اور ہیں جن میں یہی آیت ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ مقدر ہے اگرچہ بیان نہیں ہوئی۔ سورہ ص کا آغاز ہوتا ہے ﴿ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ﴿۱﴾ ”ص“ قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت (یاد دہانی) والا ہے۔ لیکن وہ لوگ کہ جو منکر ہیں گھمنڈ اور ضد میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں ”ص“ ایک حرف ہے لیکن اس سے آیت نہیں بنی جبکہ ”یس“ ایک آیت ہے۔ سورہ ص کی پہلی آیت قسم پر مشتمل ہے۔ ”بلی“ سے جو دوسری آیت شروع ہو رہی ہے یہ ثابت کر رہی ہے کہ مقسم علیہ (جس چیز پر قسم کھائی جا رہی ہے) یہاں محذوف ہے اور وہ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ ہے۔ گویا کہ معنا سے یوں پڑھا جائے گا: ﴿ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا..... ﴿۱﴾۔ اسی طرح سورہ ق میں ہے ﴿ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ﴾ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ بَلِ عَجِبُوْا اِنْ جَاءَهُمْ مُّنبِرٌ مِّنْهُمْ..... ﴿۱﴾۔

ایسے ہی دو سورتیں الزخرف اور الدخان ”حلم“ سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کی پہلی دو آیات بالکل ایک جیسی ہیں: ﴿حلم﴾ وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾۔ پہلی آیت حروف مقطعات پر اور دوسری آیت قسم پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مقسم علیہ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ محذوف مانا پڑے گا۔ گویا: ﴿حلم﴾ وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱﴾ اور ﴿حلم﴾ وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْمُبْرَحَةِ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۱﴾۔ یہ ایک اسلوب ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کی قسم کھائی گئی یعنی قرآن کی گواہی اور شہادت پیش کی گئی۔ یہ اس بات کو کہنے کا ایک اسلوب ہے کہ حضور ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا آپ کا اصل

معجزہ قرآن ہے۔

قرآن کا دعویٰ اور چیلنج

پہلے گزر چکا ہے کہ معجزے میں تحدی (چیلنج) بھی ضروری ہے اور دعویٰ بھی۔ لہذا وہ مقامات گن لیجئے جن میں چیلنج ہے کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ کا کلام ہے، انسانی کلام ہے جسے محمد ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے، یہ اُن کی اپنی اختراع ہے تو تم مقابلہ کرو اور ایسا ہی کلام پیش کرو۔ قرآن مجید میں ایسے پانچ مقامات ہیں۔ سورۃ الطور میں فرمایا:

﴿أَمْ يَقُولُونَ نَقُولُهَا بِنُوحٍ ۖ بَلْ لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۰﴾ فَلْيَاثِرُوا بِحَدِيثِنا نَقُولُهَا إِن كَانُوا صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱﴾﴾

”کیا اُن کا یہ کہنا ہے کہ یہ محمد نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہیے کہ وہ اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں۔“

قَالَ: يَقُولُ كَمَا مَعْنٰی هٰٓءِیْ كِهٰنَا۔ جبکہ نَقُولُ، يَقُولُ کا مفہوم ہے تَکْلِف کر کے کہنا، یعنی سخت کر کے کلام موزوں کرنا (جس کے لیے انگریزی میں composition کا لفظ ہے۔) تو کیا اُن کا خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں، لہذا اس طرح کی کٹ جھتیاں کر رہے ہیں۔ اگر یہ سچے ہیں تو ایسا ہی کلام پیش کریں۔ آخر یہ بھی انسان ہیں، ان میں بڑے بڑے شعراء اور بڑے قادر الکلام خطیب موجود ہیں۔ ان میں وہ شعراء بھی ہیں جن کو دوسرے شعراء سجدہ کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مل کر ایسا کلام پیش کریں۔

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ لِّیْنَ اجْمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّقُولُوْا بِحٰثِلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَقُوْنُوْنَ بِحٰثِلِهٖ وَّلَوْ كَانُوْا بِعَضُوْبِهِمْ لِیَعْنٰی كَهٰمِیْنَ ﴿۱۰۱﴾﴾

”(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام جن و انس جمع ہو جائیں (اور اپنی پوری قوت و صلاحیت اور اپنی تمام ذہانت و طہانت، قادر الکلامی کو جمع کر کے

کوشش کریں) کہ اس قرآن جیسی کتاب پیش کر دیں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں لائیں گے چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔

یہ تو بحیثیت مجموعی پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے سے مخلوق کے عاجز ہونے کا دعویٰ ہے جو قرآن مجید نے دو مقامات پر کیا ہے۔ سورہ یونس میں اس سے ذرا نیچے اتر کر جسے برسبیل تمیز کہا جاتا ہے فرمایا کہ پورے قرآن کی نظیر نہیں لاسکتے تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ! ارشاد ہوا:

﴿أَمْ يَقُولُونَ اضْرِبْنَا قُلُوبَنَا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيْنَ وَاذْعُوْا مِّنْ اَسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۰﴾ (ہود)

”کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے؟ (اے نبی! ان سے) کہیے پس تم بھی دس سورتیں بنا کر لے آؤ ایسی ہی گھڑی ہوئی اور بلا لوجس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔“

اس کے بعد دس سے نیچے اتر کر ایک سورہ کا چیلنج بھی دیا گیا:

﴿أَمْ يَقُولُونَ اضْرِبْنَا قُلُوبَنَا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهِ وَاذْعُوْا مِّنْ اَسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۱﴾ (یونس)

”کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود بنا کر لے آیا ہے؟ (اے نبی! ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لوجس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔“

یہ چاروں مقامات تو کی سورتوں میں ہیں۔ پہلی مدنی سورہ ”البقرہ“ ہے۔ اس میں بڑے اہتمام کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاتَّقُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ ۙ وَاذْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۲ ۙ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وُقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۙ اَعَدَّتْ لِلْكَٰفِرِيْنَ ۝۱۳﴾

”اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورہ تم بھی

(موزوں کر کے) لے آؤ اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (ان سب کو جمع کر لو) اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے تو بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے یہ منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“

یہاں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ حقیقت میں تم سچے نہیں ہو تمہارا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، لیکن چونکہ تم زبان سے تنقید کر رہے ہو اور جھٹلا رہے ہو تو اگر واقعتاً تمہیں شک ہے تو اس شک کو رفع کرنے کے لیے ہمارا یہ چیلنج موجود ہے۔

یہ ہیں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دو اسلوب۔ ایک مثبت انداز ہے کہ قرآن گواہ ہے اس پر کہ اے محمد ﷺ! آپ اللہ کے رسول ہیں اور دوسرا انداز چیلنج کا ہے کہ اگر تمہیں اس کے کلام الہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسا کلام تم بھی بنا کر لے آؤ۔

قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟

اب اس ضمن میں تیسری ذیلی بحث یہ ہوگی کہ قرآن مجید کس کس اعتبار سے معجزہ ہے۔ یہ مضمون اتنا وسیع اور اتنا متنوع الاطراف ہے کہ ”وجہ و اعجاز القرآن“ پر پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر بات ہے اس وقت اس کا احاطہ مخصوص نہیں ہے، صرف موٹی موٹی باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

اصل شے تو اس کی تاثیر قلب ہے کہ یہ دل کو لگنے والی بات ہے۔ اس کا اصل اعجاز یہی ہے کہ یہ دل کو جا کر لگتی ہے بشرطیکہ پڑھنے والے کے اندر تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی نہ ہو اور اسے زبان سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ براہ راست قرآن اس کے دل پر اتر سکے۔ یہ قرآن کے اعجاز کا اصل پہلو ہے۔ لیکن اضافی طور پر جان لیجئے کہ جس وقت قرآن نازل ہوا اُس وقت کے اعتبار سے اس کے معجزہ ہونے کا نمایاں اور اہم تر پہلو اس کی ادبیت، اس کی فصاحت و بلاغت، اس میں الفاظ کا انتخاب، بندشیں اور ترکیبیں، اس کی محاسن اور اس کا صوتی آہنگ ہے۔ یہ درحقیقت نزول کے وقت قرآن کے معجزہ ہونے کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ ہر رسول کو اسی طرز کا معجزہ دیا گیا جن چیزوں کا اس کے زمانے میں سب سے زیادہ چرچا اور شغف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو عام تھا لہذا مقابلے کے لیے آپ کو وہ چیزیں دی گئیں جن سے آپ جادوگروں کو شکست دے سکیں۔ حضور ﷺ نے جس قوم میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اس قوم کا اصل ذوق قدرت کلام تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اصل میں بولنے والے تو ہم ہی ہیں، باقی دنیا تو گونگی ہے۔ ان کی زبان دانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی پسند کی اشیاء کے نام رکھنا شروع کرتے تو ہزاروں نام رکھ دیتے۔ چنانچہ عربی میں شیر اور تکوار کے لیے پانچ پانچ ہزار الفاظ ہیں۔ گھوڑے اور اونٹ کے لیے لاتعداد الفاظ ہیں۔ یہ ان کی قادر الکلامی ہے کہ کسی شے کو اس کی ہر ادا کے اعتبار سے نیا نام دے دیتے۔ گھوڑا ان کی بڑی محبوب شے ہے لہذا اس کے نام معلوم کتنے نام ہیں۔ شعر و شاعری میں ان کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ ان کے ہاں سالانہ مقابلے ہوتے تھے تاکہ اس سال کے سب سے بڑے شاعر کا تعین کیا جائے۔ شعراء اپنے اپنے قصیدے لکھ کر لاتے تھے مقابلہ ہوتا تھا۔ پھر جب فیصلہ ہوتا تھا کہ کس کا قصیدہ سب پر بازاری لے گیا ہے تو باقی تمام شعراء اس کی عظمت کے اعتراف کے طور پر اس کو سجدہ کرتے تھے۔ پھر وہ قصیدہ خانہ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا تھا کہ یہ ہے اس سال کا قصیدہ۔ چنانچہ اس طرح کے سات قصیدے خانہ کعبہ میں آویزاں کیے گئے تھے جنہیں ”سَبْعَةُ مُعَلَّقَةٍ“ کہا جاتا تھا۔ سبعة معلقة کے آخری شاعر حضرت لبید بن رباحؓ تھے جو ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے شعر کہنے چھوڑ دیئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ اے لبید اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ تو جواب میں انہوں نے بڑا پیارا جملہ کہا کہ ”اَبْعَدَ الْقُرْآنَ؟“ یعنی کیا قرآن کے نزول کے بعد بھی؟ اب کسی کے لیے کچھ کہنے کا موقع باقی ہے؟ قرآن کے آ جانے کے بعد کوئی اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار کی کوشش کر سکتا ہے؟ گویا زبانیں بند ہو گئیں ان پر تالے پڑ گئے، ملک الشعراء نے شعر کہنے چھوڑ دیئے۔

جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے وہ آج بھی قرآن کے اس اعجاز کو محسوس کر

سکتے ہیں۔ غیر عرب لوگوں کے لیے اس کو محسوس کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی اپنی محنت سے عربی ادب کے اندر مولانا علی میاں^(۱) کی سی مہارت حاصل کر لے تو وہ واقعتاً اس کو محسوس کر سکے گا اور اس کی تحسین کر سکے گا کہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا کیا مقام ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے البتہ اس کا صوتی آہنگ ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی قراءت کے اندر ایک معجزانہ تاثیر ہے جو قلب کے اندر عجیب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن کا صوتی آہنگ ہماری فطرت کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ قرآن کی یہ معجزانہ تاثیر آج بھی ویسی ہے جیسی نزول قرآن کے وقت تھی۔ اس میں مرور ایام سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت اس کی ادبیت، عذوبت اور اس کے صوتی آہنگ کی معجزانہ تاثیر پر مستزاد عہد حاضر میں قرآن کے اعجاز کے ضمن میں جو چیزیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں ان میں سے ایک چیز تو وہ ہے جس کا قرآن مجید نے بڑے صریح الفاظ میں ذکر کیا ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ﴾

(حم السجدة: ۵۳)

”ہم عنقریب انہیں اپنی آیات دکھائیں گے آفاق میں بھی اور ان کی اپنی جانوں میں بھی یہاں تک کہ یہ بات ان پر واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔“

اس آیت مبارکہ میں علم انسانی کے دائرہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور جدید اکتشافات و انکشافات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیات آفاقی ہیں۔ فرانسیسی سرجن ڈاکٹر مورس بکائی کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے کہا کہ میرا دل اس پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اس قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو۔ البتہ اس دور میں جبکہ انسان کا اپنا ذہنی ظرف وسیع نہیں ہوا تھا، علوم انسانی اور معلومات انسانی کا دائرہ محدود تھا اس وقت سائنسی اشارات کی

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو اب وفات پا چکے ہیں، یَغْفِرُ اللَّهُ لَهُ وَيَرْفَعُ دَرَجَاتِهِ فِيهِ

حامل آیات قرآنیہ کا کیا مفہوم سمجھا گیا وہ بات اور ہے۔ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے اصل اہمیت تو قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے قرآن کا تورات کے ساتھ تقابل کیا ہے! تورات سے مراد Old Testament ہے۔ اناجیل اربعہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں، ان میں تو کئی چیزیں ایسی ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اناجیل میں زیادہ تر اخلاقی مواعظ ہیں یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوانح حیات ہیں۔ تورات میں یہ مباحث موجود ہیں کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی، اللہ نے کیسے اسے بنایا۔ مختلف سائنسی phenomena اس میں موجود ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ فزکس میں آج سب سے زیادہ اہم موضوع جس پر تحقیق ہو رہی ہے، یہی ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی، ابتدائی حالات کیا تھے اور بعد ازاں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے اس اعتبار سے محسوس کیا کہ تورات میں تو ایسی چیزیں ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لیے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی۔ بخت نصر کے حملے میں یروشلم کو تہس نہس کر دیا گیا اور ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی گئیں اور یروشلم کے بسنے والے چھ لاکھ کی تعداد میں قتل کر دیے گئے جبکہ بخت نصر چھ لاکھ کو قیدی بنا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے اپنے ہمراہ باہل لے گیا۔ چنانچہ یروشلم میں ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا۔ آپ اندازہ کریں، اگر یہ اعداد و شمار صحیح ہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی چھ سو سال قبل یعنی آج سے ۲۶۰۰ برس قبل یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا اور اس شہر پر کیا قیامت گزری ہوگی! اس کے بعد سے وہ اصل تورات دنیا میں نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو جو احکام عشرہ (Ten Commandments) دیے گئے تھے وہ پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں بھی لاپتہ ہو گئیں اور باقی تورات کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ قرآن حکیم میں ”صُحُفِ اِبْرٰهٖمَ وَ مُوسٰی“ کا ذکر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے پانچ ہیں جو عہد نامہ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابیں ہیں۔ سانچہ یروشلم کے قریب آڈیزھ سو برس بعد لوگوں نے تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا۔

چنانچہ اُس وقت کی نوع انسانی کی ذہنی اور علمی سطح جو تھی وہ اس پر لازمی طور پر اثر انداز ہوئی۔

ڈاکٹر مورس بکائی کے علاوہ میں ڈاکٹر کیچھ این مور کا حوالہ بھی دے چکا ہوں کہ وہ قرآن حکیم میں علم جنین سے متعلق اشارات پا کر کس قدر حیران ہوا کہ یہ معلومات چودہ سو برس پہلے کہاں سے آگئیں! فزیکل سائنسز کے مختلف فیلڈ ہیں ان میں جیسے جیسے علم انسانی ترقی کرتا جائے گا یہ بات مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی کہ یہ کلام حق ہے اور یہ کلام مظاہر طبعی کے اعتبار سے بھی حق ثابت ہو رہا ہے۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

عہد حاضر کے اعتبار سے قرآن حکیم کے اعجاز کا دوسرا اہم تر پہلو اس کی ہدایت عملی ہے۔ اس میں انفرادی زندگی سے متعلق بھی مکمل ہدایات ہیں اور انسانی اخلاق و کردار اور انسان کے رویہ کے بارے میں بھی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ انفرادی زندگی سے متعلق یہ تمام چیزیں سابقہ انبیاء کی تعلیمات میں بھی موجود ہیں۔ یہ اخلاقی اقدار ویسے بھی فطرت انسانی کے اندر موجود ہیں۔ قرآن کا اپنا کہنا ہے: ﴿فَالْهَمَّهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (الشمس) یعنی نفس انسانی کو الہامی طور پر یہ معلوم ہے کہ فجور کیا ہیں اور تقویٰ کیا ہے۔ پرہیزگاری کسے کہتے ہیں اور بدکاری کسے کہتے ہیں۔ البتہ قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس میں عدل و قسط پر مبنی اجتماعی نظام دیا گیا ہے جس میں انتہائی توازن رکھا گیا ہے۔

انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ نوع انسانی کو تین بڑے بڑے عقدہ ہائے لائیکل (dilemmas) درپیش ہیں جو توازن کے متقاضی ہیں اور ان میں عدم توازن سے انسانی تمدن نسا اور بگاڑ کا شکار ہے۔ ان میں پہلا عقدہ لائیکل یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں کیا توازن ہے؟ دوسرا یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین کیا توازن ہے؟ پھر تیسرا یہ کہ فرد اور ریاست یا فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق و فرائض کے اعتبار سے کیا توازن ہے؟ ان تینوں معاملات میں توازن قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔

اگر فرد کو ذرا زیادہ آزادی دے دی جاتی ہے تو انارکی (chaos) پھیلتی ہے۔ آزادی کے نام پر دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے! دوسری طرف اگر فرد کی آزادی پر قد غنیں اور بندشیں لگا دی جائیں تو وہ رد عمل ہوتا ہے جو کمیونزم کے خلاف ہوا۔ فطرت انسانی اور طبیعت انسانی نے یہ قد غنیں قبول نہیں کیں اور ان کے خلاف بغاوت کی۔

عورت اور مرد کے حقوق کے مابین توازن کا معاملہ بھی انتہائی حساس ہے۔ اس میزان کا پلڑا اگر ذرا سا سردی کی جانب جھکا دیا جائے تو عورت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی وہ بالکل بھیڑ بکری کی طرح مرد کی ملکیت بن کر رہ جاتی ہے اس کا کوئی تشخص نہیں رہتا اور وہ مرد کی جوتی کی نوک قرار پاتی ہے۔ لیکن اگر دوسرا پلڑا ذرا جھکا دیا جائے تو عورت کو جو حیثیت مل جاتی ہے وہ قوموں کی قسمتوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اس سے خاندانی ادارہ ختم ہو جاتا ہے اور گھر کے اندر کا چین اور سکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال سکیٹلینڈ ہے نیوین ممالک ہیں۔ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ روئے ارضی پر اگر جنت دیکھنی ہو تو ان ممالک کو دیکھ لیا جائے۔ وہاں کے شہریوں کی بنیادی ضروریات کس حد تک پوری ہو رہی ہیں! وہاں علاج اور تعلیم کی سہولیات سب کے لیے یکساں ہیں اور اس ضمن میں خیرات (charity) پر پلنے والوں اور ٹیکس ادا کرنے والوں کے مابین کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے۔ لیکن ان ممالک میں مرد اور عورت کے حقوق کے مابین توازن برقرار نہیں رکھا گیا جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ مضمحل ہوا، بلکہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گیا اور گھر کا سکون ناپید ہو گیا۔ چنانچہ آج خود کشی کی سب سے زیادہ شرح سویڈن میں ہے۔ اس لیے کہ گھر کا سکون ختم ہو جانے کے باعث اعصاب پر شدید تناؤ ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ برقرار ہے۔ اگرچہ یہاں بھی نام نہاد طور پر بہت اونچی سطح کے لوگوں کے ہاں تو وہ صورتیں پیدا ہو گئی ہیں تاہم مجموعی طور پر ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ ابھی کافی حد تک محفوظ ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں لفظ ”سکون“ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الروم کی آیت ۲۱ ملاحظہ ہو:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ
بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾

”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی نوع
سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان
محبت اور رحمت پیدا کر دی۔“

اگر انسان کو یہ سکون نہیں ملتا تو اگرچہ اس کی کھانے پینے کی ضروریات، جنسی تسکین
اور دوسری ضروریات زندگی خوب پوری ہو رہی ہوں لیکن زندگی انسان کے لیے جہنم
بن جائے گی۔

مذکورہ بالا تین عقدہ ہائے لائیکل میں سے معاشیات کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔
سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع دیں گے تو صورت حال ایک انتہا کو پہنچ جائے گی اور
مزدور کا بدترین استحصال ہوگا جبکہ مزدور کو زیادہ حقوق دے دیں گے تو سرمائے کو کوئی
تحفظ حاصل نہیں رہے گا۔ اگر نیشنلائزیشن ہو جائے تو لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ ہی
نہیں رہتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں نیشنلائزیشن کے بعد کیا ہوا! روس کی
اقتصادی موت کی اہم وجہ یہی نیشنلائزیشن تھی۔ تو اب سرمائے اور محنت میں توازن کے
لیے کیا شکل اختیار کی جائے؟ یہ ہے درحقیقت عہد حاضر میں قرآن کی ہدایت کا اہم
ترین حصہ! آج اس پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ فزیکل سائنسز سے
قرآن کی حقانیت کے ثبوت خود بخود ملتے چلے جائیں گے۔ جیسے جیسے سائنس ترقی کر
رہی ہے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں اور ان سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ قرآن حق
ہے۔ لیکن آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن حکیم نے عمرانیات، انسانیہ اور
اجتماعیات مثلاً اقتصادیات، سیاسیات اور سماجیات کے ضمن میں جو عدل اجتماعی دیا ہے
اس کو مبرہن کیا جائے۔ علامہ اقبال کے یہ دو شعر اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہے ہیں:

ہر کجا بنی جہان رنگ و نو
آن کہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نور مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است!

یعنی دنیا میں جو سوشل انقلاب آیا ہے اس کی ساری چمک دمک اور روشنی یا تو نور مصطفیٰ ﷺ ہی سے مستعار اور ماخوذ ہے یا پھر انسان چاروناچار حضور ﷺ کے لائے ہوئے نظام ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ دائیں بائیں کی ٹھوکریں اور افراط و تفریط کے دھکے کھا کر لڑکھڑاتا ہوا چاروناچار اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم نے اسے پہنچایا تھا۔

عہد حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علامہ اقبال

وجودِ اعجازِ قرآن کے ضمن میں ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک عہد حاضر میں قرآن کے اعجاز کا سب سے بڑا مظہر علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص ناظر میں آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوا تھا۔ اس کے اولین مخاطب عرب کے اجڑ دیہاتی بدو اور ناخواندہ لوگ تھے جنہیں قرآن نے ”اٰمّیین“ اور ”قوٰعاً لّدنا“ قرار دیا ہے۔ لیکن اس قرآن نے ان کے اندر بجلی دوڑادی۔ ان کے ذہن قلب اور روح کو متاثر کیا، پھر ان میں ولولہ پیدا کیا، ان کے باطن کو منور کیا۔ ان کی شخصیتوں میں انقلاب آیا اور افراد بدل گئے۔ پھر انہوں نے اسی قوت کی حیثیت اختیار کی کہ جس نے دنیا کو ایک نیا تمدن نئی تہذیب اور نئے قوانین دے کر ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ لیکن بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسا ایک شخص جس نے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا، جس نے مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھ لیے، جو قدیم اور جدید دونوں کا جامع تھا، جو جرمنی اور انگلستان میں جا کر فلسفہ پڑھتا رہا، اس کو اس قرآن نے اس طرح possess کیا اور اس پر اس طرح اپنی چھاپ قائم کی کہ اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور اس کی تفکّی علم کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے۔ گویا بقول خود

اُن کے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی

مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز ہیں!

میرا ایک کتابچہ ”علامہ اقبال اور ہم“ ایک عرصے سے شائع ہوتا ہے۔ یہ میری ایک تقریر ہے جو میں نے اپنی سن کالج میں ۱۹۷۳ء میں کی تھی۔ اس میں میں نے علامہ اقبال کے لیے چند اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ”اقبال اور قرآن“ کے عنوان سے میں نے علامہ اقبال کو (۱) عظمت قرآن کا نشان (۲) واقعہ مرتبہ و مقام قرآن اور (۳) داعی الی القرآن کے خطابات دیے ہیں۔ میں علامہ اقبال کو اس دور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن مجید کے علوم و معارف کی جو تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے اس دور میں کوئی دوسری شخصیت اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچی۔ ان سے لوگوں نے چیزیں مستعار لی ہیں اور پھر اُن کو بڑے پیمانے پر پھیلا یا ہے۔ ان حضرات کی یہ خدمت اپنی جگہ قابل قدر ہے، لیکن فکری اعتبار سے وہ تمام چیزیں علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

مذکورہ بالا کتابچے میں میں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی گواہی بھی شائع کی ہے۔ کئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا آنکھوں کے آپریشن کے لیے خانقاہ ڈوگران سے لاہور آئے ہوئے تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔ گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے اُن کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ معطل ہو گیا۔ تاہم فرصت کے اُن ایام میں مولانا نے علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام دوبارہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے دو تاثر بیان کیے۔ مولانا کا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ ”قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!“ مولانا اصلاحی صاحب کا دوسرا تاثر یہ تھا کہ ”اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا

دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حدی خواں اس اُمت میں پیدا ہوا، لیکن یہ اُمت اس سے
مس نہ ہوئی تو ہاشما کے کرنے سے کیا ہوگا! جو قوم علامہ اقبال کے کلام سے حرکت
میں نہیں آئی اسے کون حرکت میں لاسکے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور سب
سے بڑا داعی الی القرآن علامہ اقبال ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس
گیرائی اور گہرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال کو ہوا ہے میری معلومات کی حد تک
(اگرچہ میری معلومات محدود ہیں) اس درجے قرآن کی عظمت کا انکشاف کسی اور
انسان پر نہیں ہوا۔ جب وہ قرآن مجید کی عظمت بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ یہ اُن کی دید اور اُن کا تجربہ ہے، کیونکہ جس انداز سے وہ بات بیان کرتے ہیں وہ
تکلف اور آورد سے ماوراء انداز ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ علامہ اقبال قرآن مجید کے
بارے میں کیا کہتے ہیں:۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لا یزال است و تقدیم
نسخہ اسرار نکوین حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے، تبدیل نے
آیہ اش شرمندہ تاویل نے
فاش گویم آنچه در دل مضمّن است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیدا است ایں
زندہ و پائندہ و گویا است ایں
چوں بجاں در رفت جاں دیگر
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

”وہ زندہ کتاب‘ قرآن حکیم‘ جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!
زندگی کے وجود میں آنے کا خزینہ‘ جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے
بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ رد و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی
آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ
بھی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

یہ ذاتِ حق سبحانہ و تعالیٰ (کا کلام ہے لہذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور
ظاہر بھی اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!

(یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک
انقلاب برپا ہو جاتا ہے‘ اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس

کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے۔

قرآن حکیم کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:-

صد جهان تازہ در آیاتِ اوست

عصر ہا بچیدہ در آفاتِ اوست!

”اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے
میں بے شمار زمانے موجود ہیں۔“ (گویا ہر زمانے میں یہ قرآن ایک نئی شان

اور نئی آن بان کے ساتھ دنیا میں آیا ہے اور آتا رہے گا۔)

اب آپ علامہ اقبال کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

مناجات کرتے ہوئے کہے۔ ان سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ انہیں کتنا یقین تھا کہ
میرے فکر کا منبع قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ ”مثنوی اسرار و رموز“ کے آخر میں ”عرض

حال مصنف بحضور رحمة للعالمین“ کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ:-

گر دلم آئینہ بے جوہر است

در بحر غم غیر قرآن مضمحل است

پردہ ناموسِ فکرم چاک کن
 این خیاباں را زخارم پاک کن!
 روز محشر خوار و رسوا کن مرا!
 بے نصیب از بوسہ پا کن مرا!

”اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو، اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے تو (اے نبی ﷺ!) آپ میرے ناموسِ فکر کا پردہ خود چاک فرمادیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں۔ (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرمادیں!“

میں نے اپنی امکانی حد تک قرآن حکیم کا پوری باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر غور و فکر اور سوچ بچار کیا ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا اردو اور فارسی کلام بھی پڑھا ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ بات ریکارڈ کرانی ضروری سمجھی ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں میں نے جو بات ۱۹۷۳ء میں کہی تھی آج بھی میں اسی بات پر قائم ہوں کہ ”اس دور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن کا انکشاف جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو“۔ اور یہ کہ میرے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور داعی الی القرآن اقبال ہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں کی قرآن سے دُوری پر مرثیہ کہتے ہیں:-

جاننا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآن نہیں

ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں!

مسلمانوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

بآیتش ترا کارے جز این نیست

کہ از یسین او آساں بمیری!

”اس قرآن کے ساتھ تمہارا اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ تم کسی شخص کو عالم نزع میں اس کی سورہ یٰسّٰ سنادو تا کہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔“

ہمارے ہاں صوفی اور واعظ حضرات نے قرآن کو چھوڑ کر اپنی مجالس اور اپنے وعظ کے لیے کچھ اور چیزوں کو منتخب کر لیا ہے تو اس پر اقبال نے کس قدر دردناک مریچے کہے ہیں اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

صوفی پشینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نعمتِ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دیش
در نمی سازد بقرآن محفلش

اور

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنی او پست و حرف او بلند
از خطیب و دیلمی گفتار او
یا ضعیف و شاذ و مرسل کار او!

”ادنی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی بے شکوہ اور بلند و بالا ہیں، لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمی سے، اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف، شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!“

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور امت مسلمہ کے عکبت

افلاس اور ذلت و خواری کا اصل سبب قرآن سے ذوری اور کتاب الہی سے بعد ہی ہے۔ چنانچہ ”جواب شکوہ“ کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

بعد میں اسی مضمون کا اعادہ علامہ مرحوم نے فارسی میں نہایت پر شکوہ الفاظ اور حد درجہ درد انگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا:

خوار از مجبوری قرآن شدی
شکوہ رخ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں اکتدہ
در بغل داری کتابِ زندہ!

”(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے، لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزامِ گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے)! اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے)۔“

میں اپنا یہ تاثر ایک بار پھر دہرا رہا ہوں کہ عصرِ حاضر میں قرآن کی عظمت جس درجہ اُن پر منکشف ہوئی تھی، میں اپنی محدود معلومات کی حد تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک علامہ اقبال دورِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا ایک عظیم مظہر ہیں۔

قرآن مجید سے ہمارا تعلق

قرآن ”حبل اللہ“ ہے!

جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ”حبل اللہ“ ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ”حبل“ کے ایک معنی رسی کے ہیں اور یہی اصل معنی ہیں۔ سورۃ اللہب میں یہ لفظ آیا ہے: ﴿حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ یعنی مونج کی مٹی ہوئی رسی۔ امام راغبؒ نے اس کی تعبیر کی ہے: ”استعیر للوصل ولكل ما یوصل بہ الی شیء“ یعنی کسی شے سے جڑنے کے لیے اور جس شے سے جڑا جائے اس کے لیے استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عہدِ قول وقرآن اور میثاقِ دو فریقوں کو باہم جوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ عہد کے معنی میں بھی آتا ہے اور قرآن حکیم میں یہ ایسے عہد کے لیے آیا ہے جس سے کسی کو امن مل رہا ہو، حفاظت اور امان حاصل ہو رہی ہو۔ سورۃ آل عمران (آیت ۱۱۲) میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةَ اِنَّ مَا قَفُّوْا اِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللّٰهِ وَحَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءٌ وَبَغَضٌ مِّنَ اللّٰهِ وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةَ﴾

”یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی سوائے اس کے کہ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں ان پر محتاجی اور کم ہمتی مسلط کر دی گئی ہے۔“

گویا خود اپنے بل پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر خود مختاری کی اساس پر ان کے لیے عزت کا معاملہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کی پیشین گوئی ہے اور موجودہ ریاست اسرائیل اس کا واضح ثبوت ہے۔ امریکہ اگر ایک دن کے لیے بھی اپنی حفاظت ہٹالے تو اسرائیل کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

قرآن مجید میں اہل ایمان سے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ (آل عمران: ۱۰۳) ”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو سب مل کر“۔ البتہ ”حبل اللہ“ کیا ہے؟ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ اور قرآن مجید میں جو بات پوری طرح واضح نہ ہو، مجمل ہو، اس کی تشریح اور تبیین رسول اللہ ﷺ کا فرض منہی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (التخل: ۴۴) ”اور ہم نے (اے نبی) آپ کی طرف ’الذکر‘ نازل کیا، تاکہ جو چیز ان کے لیے اتاری گئی ہے آپ اسے ان پر واضح کریں“۔ چنانچہ احادیث نبویؐ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ”حبل اللہ“ قرآن مجید ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَلَا وَابْنِي تَارِكٌ فِيكُمْ تَقْلِينَ، أَحَدُهُمَا كِتَابُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ هُوَ حَبْلُ اللَّهِ.....))

”آگاہ رہو! میں تمہارے مابین دو خزانے چھوڑے جا رہا ہوں، ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے وہی حبل اللہ ہے.....“

قرآن حکیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، جس میں الفاظ آئے ہیں: ((هُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ)) ”یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے“۔ یہ روایت سنن ترمذی اور سنن دارمی میں موجود ہے۔ مزید برآں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت رزین میں آئی ہے اس میں بھی یہی الفاظ ہیں: ((هُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ)) ”یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے“۔ سنن دارمی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ حَبْلُ اللَّهِ وَالنُّورُ الْمُبِينُ)) ”یقیناً یہ قرآن حبل اللہ اور نور مبین ہے“۔

قرآن کو ”رستی“ کس اعتبار سے کہا گیا ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو بندہ اس رسی کے ذریعے اللہ سے جڑتا ہے۔ یہ رسی ہمیں اللہ سے جوڑنے والی ہے۔ ”وتعلق مع

اللہ“ اور ”تقرب الی اللہ“ دونوں تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ تعلق کے معنی ہیں لنگ جانا۔ ”علق“ لنگی ہوئی شے کو کہتے ہیں۔ ”تعلق مع اللہ“ کا مفہوم ہوگا اللہ سے لنگ جانا یعنی اللہ سے چٹ جانا اللہ کے ساتھ جڑ جانا۔ اسی طرح ”تقرب الی اللہ“ کا مطلب ہے اللہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنا۔ سلوک اور طریقت کا مقصد یہی ہے۔ تعلق مع اللہ میں اضافے اور تقرب الی اللہ کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔

اس اعتبار سے دو حدیثیں ملاحظہ کیجیے۔ ایک کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((الْقُرْآنُ حَبْلُ اللَّهِ الْمَمْدُودُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ)) ”یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے“۔ یہی الفاظ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی روایت کیے گئے ہیں۔ یعنی اگر اللہ سے جڑنا ہے اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے تو اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو اس سے تم اللہ سے جڑ جاؤ گے اللہ کا قرب حاصل کر لو گے۔

دوسری مجسم کبیر طبرانی کی بڑی پیاری روایت ہے۔ اس میں ان الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو آپ نے مسجد کے گوشے میں دیکھا کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کا مذاکرہ کر رہے تھے قرآن کو سمجھ اور سمجھا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور بڑا پیارا سوال کیا: ((الَسْتُمْ تَشْهَدُونَ أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَآتَى رَسُولُ اللَّهِ وَأَنَّ هَذَا الْقُرْآنُ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ؟)) ”کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا: ”بلیٰ یَا رَسُولَ اللَّهِ!“ یعنی ”کیوں نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم اس کے گواہ ہیں! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَاسْتَبْشِرُوا فَإِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ طَرَفَةٌ بِأَيْدِيكُمْ وَطَرَفَةٌ بِيَدِ اللَّهِ)) ”پس تم خوشیاں مناؤ اس لیے کہ یہ قرآن وہ شے ہے جس کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور دوسرا اللہ کے ہاتھ میں ہے“۔ ان احادیث مبارکہ

سے ”حبل اللہ“ کا یہ تصور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی شے ہے۔ ابھی ہم نے جس حدیث کا مطالعہ کیا اس میں قرآن حکیم کے لیے ”جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“ کے الفاظ آئے ہیں کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ مستدرک حاکم اور مراسیل ابی داؤد میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے: ((انکم لا ترجعون الی اللہ بشئٍ ء افضل مما ُخرج منه یعنی القرآن)) یعنی تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود اسی (اللہ تعالیٰ) سے نکلی ہے یعنی قرآن مجید۔ درحقیقت قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اور کلام منکلم کی صفت ہوتا ہے تو اس سے بڑھ کر قریب ہونے کا کوئی اور ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو گویا وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ تبع تابعین کے دور کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ سال میں چھ مہینے سرحدوں پر جہاد میں شریک ہوتے۔ اُس دور میں دارالاسلام کی سرحدیں بڑھ رہی تھیں اور اس کے لیے جہاد جاری تھا۔ جبکہ چھ مہینے آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر پر گزارتے اور اس عرصے میں لوگوں سے ملنے جلنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ صرف نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتے، باقی وقت گھر پر ہی رہتے۔ کسی نے کہا کہ عبداللہ! آپ تنہائی پسند ہو گئے ہیں، تنہائی سے آپ کی طبیعت اکتاتی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ”کیا تم اُس شخص کو تنہا سمجھتے ہو جو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے؟“ لوگ حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جب اس کی وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا کہ دیکھو جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو قرآن پڑھتا ہوں یا حدیث پڑھتا ہوں۔ جب قرآن پڑھتا ہوں تو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہوں اور جب حدیث پڑھتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہوں۔ تم مجھے تنہا نہ سمجھو۔

دیوانہ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا
عالم ہے ان گلوں میں پھولوں میں بستیاں ہیں!

مسند احمد، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث نبوی منقول ہے:

((يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرْتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُهَا))

” (قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور (جنت کے درجات پر) چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ پس تیرا مقام وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔“

لیکن واضح رہے کہ صاحب قرآن سے مراد صرف حافظ قرآن یا ہمارے ہاں پائے جانے والے قاری نہیں ہیں بلکہ وہ حافظ اور قاری مراد ہیں جو قرآن کے علم و حکمت سے بھی واقف ہیں اس کو پڑھتے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ جنت میں اس قرآن کے ذریعے ان کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی اور ان کا آخری مقام وہاں معین ہوگا جہاں ان کا سرمایہ قرآن ختم ہوگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ اور وصل الی اللہ کا موثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ میں نے اسی لیے امام راغب کے الفاظ کا حوالہ دیا تھا کہ ”جبل“ کا لفظ وصل کے لیے استعارۃ استعمال ہوتا ہے اور یہ ہر اُس شے کے لیے استعمال ہوگا جس کے ذریعے کسی شے کے ساتھ جڑا جائے۔ اس معنی میں جبل اللہ قرآن مجید ہے۔

اگر پیراشوٹ کی مثال سامنے رکھیں تو جملہ ایمانیات اس قرآن کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جس طرح پیراشوٹ کی چھتری کی رسیاں نیچے آ کر ایک جگہ جڑ جاتی ہیں۔ جب پیراشوٹ کھلتا ہے تو اس کی چھتری کس قدر وسیع ہوتی ہے لیکن اس کی ساری رسیاں ایک جگہ آ کر جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ایمانیات کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب قرآن کے ساتھ منسلک ہیں۔ چنانچہ قرآن پر یہ یقین مطلوب ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے بلکہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ کلام بھی ذات باری تعالیٰ ہی سے صادر ہوا ہے اور میری

روح بھی اللہ ہی کے امر سن کا ظہور ہے۔ اس انداز سے قرآن پر یقین اللہ تعالیٰ پر یقین اور قرآن لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ پر یقین مطلوب ہے۔ (”حقیقت ایمان“ کے موضوع پر میری پانچ تقاریر میں یہ مضمون آچکا ہے)۔

ایک ایمان تو تقلیدی ہے یعنی غیر شعوری ایمان کہ ایک یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے چاہے وہ علی وجہ البصیرت نہ ہو اور وہ بھی بہت بڑی دولت ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی ایمان وہ ہے جو علی وجہ البصیرت ہو۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ (یوسف: ۱۰۸) ”(اے نبی!) کہہ دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور جو میرے ساتھ ہیں (وہ بھی)۔“ علی وجہ البصیرت ایمان یعنی شعوری ایمان، اکتسابی ایمان اور حقیقی ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ مولانا ظفر علی خان بہت ہی سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کر گئے ہیں:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ قلعہ سے

ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سینپاروں میں!

عاقل یعنی غور و فکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے کے لیے ایمان کا منبع و سرچشمہ صرف قرآن حکیم ہے۔

قرآن حکیم کے ”جبل اللہ“ ہونے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اہل ایمان کو جوڑنے والی رشتی ان کو باہم ایک دوسرے سے بانڈھ دینے والی شے ان کو بنیاد مرصوص بنانے والی چیز یہ قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ کی رشتی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی باہم متفرق ہونے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ ”اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رشتی کو سب مل جل کر اور تفرقہ مت ڈالو!“ اہل ایمان کو جوڑنے والی اور بنیاد مرصوص بنانے والی رشتی یہی قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ انسانی اتحاد وہی مستحکم اور پائیدار ہوگا جو فکر و نظر کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ بہت سے اتحاد وقتی طور پر

وجود میں آجاتے ہیں۔ جیسے کچھ سیاسی مصلحتیں ہیں تو اتحاد قائم کر لیا، کوئی دنیاوی مفادات ہیں تو ان کی بنا پر اتحاد قائم کر لیا۔ یہ اتحاد حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ہی پائیدار اور مستحکم ہوتے ہیں۔ انسان حیوانِ عاقل ہے۔ یہ سوچتا ہے، غور کرتا ہے، اس کے نظریات ہیں، اس کے کچھ اہداف و مقاصد ہیں، کوئی نصب العین ہے۔ نظریات، مقاصد اور نصب العین کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ تو جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہو کوئی اتحاد پائیدار اور مستحکم نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے اللہ کی اس رستی کو مضبوطی سے تھامو گے تو گویا دو رشتے قائم ہو گئے۔ ایک رشتہ اہل ایمان کا اللہ کے ساتھ اور ایک رشتہ اہل ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ۔ جیسے کل شریعت کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی سب سے بڑی عبادت نماز ہے اور بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی شے زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح جبل اللہ ایک طرف اہل ایمان کو اللہ سے جوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اہل ایمان کو آپس میں جوڑ رہی ہے۔ یہ انہیں بنیانِ مرصوص اور ”کَجَسَدٍ وَّأَحَدٍ“ بنا دینے والی شے ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے کہا ہے:-

از یک آئینی مسلمان زندہ است

بیکر ملت ز قرآن زندہ است

ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست

اعتصامش کن کہ جبل اللہ اوست!

”وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں، ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ لہذا اے مسلمان! تو قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کہ ’جبل اللہ یہی ہے‘۔“

جبل اللہ کے بارے میں مفسرین کے ہاں بہت سے اقوال ملتے ہیں کہ جبل اللہ سے مراد قرآن ہے، کلمہ طیبہ ہے، اسلام ہے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ پر درست ہیں

لیکن حدیث نبوی کی روشنی میں اس کا مصداق کامل قرآن ہی ہے۔ اور پھر اس کی جس قدر عمدہ تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے یہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی میرے نزدیک بہت عمدہ مقام ہے۔

ما ہمہ خاک و دلی آگاہ اوست

اعضاش کن کہ جل اللہ اوست!

نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ کے الفاظ کے بعد فرمایا گیا ہے: ﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ (آل عمران: ۱۰۳) ”اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو کہ جب تم باہم دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا تو تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے۔“ یہ قرآن مجید ہی ہے جو اہل ایمان کے دلوں کو جوڑتا اور ان کو باہم پیوست کرتا ہے اور یہ دلی تعلق اور دلی ہم آہنگی ہی ہے جو مسلمانوں کو بنیادیں مرصوص بنانے والی شے ہے۔

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

تعارف قرآن کے ضمن میں جو کچھ میں نے عرض کیا ان سب باتوں کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے وہ کیا ہے؟ یعنی قرآن حکیم کے بارے میں مجھ پر اور آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس کے اعتبار سے میں خاص طور پر اپنی کتاب ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری تحریک رجوع الی القرآن کے لیے دو بنیادوں میں سے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا تھا۔ ابتدائی چھ سات سال تو میں تنہا تھا۔ نہ کوئی انجمن تھی نہ کوئی ادارہ نہ جماعت۔ پھر انجمن خدام القرآن قائم ہوئی، پھر ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ قرآن اکیڈمی کی تعمیرات مکمل ہونے کے بعد پھر اسی کے بطن سے قرآن کالج کی ولادت ہوئی، جس کے سر پر قرآن آڈیو ریم کا تاج سجا ہوا ہے۔ اس پوری جدوجہد کی

بنیاد اور اساس دو کتاہے ہیں: (۱) "اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام"۔ یہ مضمون میں نے ۱۹۶۷ء میں میثاق کے ادارے کے طور پر لکھا تھا۔ (۲) "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"۔ یہ کتابچہ میری دو تقریروں پر مشتمل ہے جو میں نے ۱۹۶۸ء میں کی تھیں۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں جشن خیر اور جشن مہران وغیرہ جیسے مختلف عنوانات سے جشن منائے جا رہے تھے جن میں راگ رنگ کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ صدر ایوب خان کا زمانہ تھا۔ اگرچہ شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے لیکن "سب اچھا ہے" کے اظہار کے لیے یہ شاندار تقریبات منعقد کی جا رہی تھیں۔ یہ گویا اُن کے دور حکومت کی آخری بھڑک تھی جیسے بھجنے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے: "مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے!" لیکن اُن دنوں ذکر و فکر کی بجائے لوگوں کو راگ رنگ کی محفلوں میں مست رکھنے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں مذہبی لوگوں کو رشوت کے طور پر "جشن نزول قرآن" عطا کیا گیا کہ تم بھی جشن مناؤ اور اپنا ذوق و شوق پورا کر لو۔ چنانچہ چودہ سو سالہ "جشن نزول قرآن" کا انعقاد ہوا۔ اس کے ضمن میں قرأت کی بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوئیں جن میں پوری دنیا سے قراء حضرات شریک ہوئے۔ اسی سلسلے میں سونے کے تار سے قرآن لکھنے کا پروجیکٹ شروع ہوا۔

اُس وقت میرا ذہن منتقل ہوا کہ کیا قرآن حکیم کا ہم پر یہی حق ہے؟ کیا اپنے ان کاموں سے ہم قرآن مجید کا حق ادا کر رہے ہیں؟ چنانچہ میں نے مسجد خضراء من آباد میں اپنے دو خطابات جمعہ میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق بیان کیے کہ ہر مسلمان پر حسب استعداد قرآن مجید کے پانچ حق عائد ہوتے ہیں:

- (۱) اسے ماننے جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔ (ایمان و تعظیم)
- (۲) اسے پڑھے جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ (تلاوت و ترتیل)
- (۳) اسے سمجھے جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔ (تذکر و تدبر)

(۴) اس پر عمل کرے جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے۔ (حکم و اقامت)

انفرادی زندگی میں حکم بالقرآن یہ ہے کہ ہماری ہر رائے اور ہر فیصلہ قرآن پر مبنی ہو۔ اور اجتماعی زندگی میں قرآن پر عمل کی صورت اقامت ما انزل من اللہ یعنی قرآن کے عطا کردہ نظام عدل اجتماعی کو قائم کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا

أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ﴾ (المائدة: ۶۸)

”اے کتاب والو! تمہارا کوئی مقام نہیں جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری جانب نازل کیا گیا ہے تمہارے رب کی طرف سے۔“

(۵) قرآن کو دوسروں تک پہنچانا اسے پھیلانا اور عام کرنا۔ (تبلیغ و تبيين)

ان پانچ عنوانات کے تحت الحمد للہ ثم الحمد للہ یہ بہت جامع کتابچہ مرتب ہوا اور

بلا مبالغہ یہ لاکھوں کی تعداد میں چھپا ہے۔ پھر انگریزی، عربی، فارسی، پشتو، تامل، ملیشیا کی

زبان اور سندھی میں اس کے تراجم ہوئے۔ جو حضرات بھی ہماری اس تحریک رجوع الی

القرآن سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں، میرے دروس میں شریک ہوتے ہیں یا ہمارے لٹریچر

کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں میرا نام نہ مشورہ ہے کہ اس کتابچے کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ

درحقیقت ”تعارف قرآن“ پر میرے خطابات کا لازمی نتیجہ اور ان کا ضروری نکتہ ہے۔

یہ بھی جان لیجیے کہ اگر ہم یہ حقوق ادا نہیں کرتے تو از روئے قرآن ہماری حیثیت

کیا ہے۔ قرآن مجید کے حقوق کو ادا نہ کرنا قرآن کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔

سورۃ الفرقان میں محمد رسول اللہ ﷺ کی فریاد نقل ہوئی ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ۗ﴾

”اور پیغمبر کہے گا کہ اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ

رکھا تھا۔“

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کے ذیل میں حاشیہ میں لکھا ہے:

”آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا اس

میں تذبذب نہ کرنا اس پر عمل نہ کرنا اس کی تلاوت نہ کرنا اس کی صحیح قراءت کی

طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجران قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔

بحیثیت مسلمان ہم پر قرآن مجید کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں اگر انہیں ہم ادا نہیں کر رہے تو حضور ﷺ کے اس قول اور فریاد کا اطلاق ہم پر بھی ہوگا۔ گویا کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے خلاف مدعی کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔

علامہ اقبال اسی آیت قرآنی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں:

خوار از مجبوری قرآن شدی

شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی!

”(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے، لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!“

قرآن مجید میں دو مقامات پر قرآن کے حقوق ادا نہ کرنے کو قرآن کی تکذیب قرار دیا گیا ہے۔ آپ لاکھ سمجھیں کہ آپ قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں، لیکن اگر آپ اس کے حقوق کی ادائیگی اپنی استعداد کے مطابق اپنی امکانی حد تک نہیں کر رہے تو درحقیقت قرآن کو جھٹلا رہے ہیں۔ سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود کے بارے میں سورۃ الجمعہ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْيَمَانِ يَحْمِلُ
أَسْفَارًا ۗ وَسِمْ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظَّالِمِينَ﴾

”مثال ان لوگوں کی جو حاملِ تورات بنائے گئے پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا اُس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ نری مثال ہے اُس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

ہمیں کانپنا چاہیے لرزنا چاہیے کہ کہیں ہمارا شمار بھی انہی لوگوں میں نہ ہو جائے۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ الواقعہ کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات ہیں:

﴿فَلَا أَقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ ۖ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّو تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ۚ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۚ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۚ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۚ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۚ أَفَبِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُذْهِبُونَ ۚ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْكُمْ تُكَذِّبُونَ ۚ﴾

”پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں ثبت جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟“

اس قرآن اس عظمت والی کتاب جو کتاب کریم ہے کتاب مکنون ہے کے بارے میں تمہاری یہ سستی تمہاری یہ کسل مندی تمہاری یہ ناقدری اور تمہارا یہ عملی تعطل کہ تم اسے جھٹلا رہے ہو! تم نے اپنا حصہ اور نصیب یہ بنا لیا ہے کہ تم اس کی تکذیب کر رہے ہو؟ تکذیب اس معنی میں بھی کہ قرآن کا انکار کیا جائے اسے اللہ کا کلام نہ مانا جائے۔ اور تکذیب عملی کے ضمن میں وہ چیز بھی اس کے تابع اور شامل ہوگی جو میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی حامل کتاب الہی ہونے کے باوجود اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے کہ ہم بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص کو ان حقوق کے ادا کرنے کی اپنی امکانی حد تک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لي ولكم ولسان المسلمين والمسلمات 00

عظمتِ قرآن

قرآن و حدیث کے آئینے میں

۱۲ نومبر ۲۰۰۲ء کا خطاب جمعہ

فصله وفضلہ علی رسولہ الکریم اما بعد:

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم
 ﴿حَسْبُ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ مَبْرُوكًا لِيَتَّبِعُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٥٠﴾﴾ (ص)

رمضان المبارک کا دو گونہ پروگرام اور اس کا حاصل

رمضان المبارک کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کا اصل
 حمد قرآن حکیم ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ
 الْقُرْآنُ﴾ ”رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔“ اس میں جو دو عبادات
 رکھی گئیں ان میں سے ایک کو فرض قرار دیا گیا اور ایک کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔
 رمضان میں دن کا روزہ فرض قرار دیا گیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے رات کا قیام بندے کی
 مرضی پر چھوڑ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی راتوں میں قیام اللیل کی بہت زیادہ
 ترغیب دلائی۔ چنانچہ احادیث میں دن کے روزے اور رات کے قیام کا ذکر بالکل
 متوازی طور پر ہوا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے:

﴿مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَ مَنْ قَامَ
 رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ﴾

”جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے

ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔“

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
 ((الصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُولُ الصِّيَامُ: أَيْ رَبِّ إِنِّي مَنَعْتُهُ
 الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفَعْنِي فِيهِ وَيَقُولُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ
 بِاللَّيْلِ فَشَفَعْنِي فِيهِ فَيُشَفَّعَانِ)) (رواہ احمد والطبرانی والبیہقی)

”روزہ اور قرآن بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: پروردگار! میں نے تیرے اس بندے کو دن کے وقت کھانے پینے سے اور اپنی خواہشات نفس پوری کرنے سے روک رکھا تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما! قرآن کہے گا: پروردگار! میں نے تیرے اس بندے کو رات کے وقت سونے سے روک رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما! پس دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔“

رات کو جاگنا درحقیقت جو مطلوب ہے وہ کم سے کم تہائی رات ہے۔ ورنہ آدمی رات یا دو تہائی رات قیام کیا جائے جیسا کہ سورۃ المومل کی ابتدائی آیات میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا۔ لیکن بیگم ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ مرد و زور اور کاشت کار جو دن بھر محنت کرتے ہیں ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کا قیام فرض نہیں کیا گیا۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں تراویح کا نظام جاری کر دیا کہ نماز عشاء کے ساتھ حصل میں رکعت میں لوگ ایک پارے کے لگ بگ قرآن سن لیں تاکہ ہر مسلمان اس مہینے میں قرآن میں سے گزر جائے۔ ان لوگوں کا تو معاملہ یہ تھا کہ ان کی اپنی زبان عربی تھی اور ان کے لیے قرآن کو سمجھنے کے لیے اس کا سننا ہی کافی تھا۔ وہ براہ راست ان کے ذہن و قلب میں سرایت کر جاتا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ میں رمضان المبارک کے پورے پروگرام کا حاصل باہم الفاظ بیان کر دیا گیا:
 ((وَتَسْبِّحُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ)) اور تاکہ تم اللہ کی

بڑائی کرو اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت بخشی اور تاکہ شکر کرو۔ یعنی قرآن جیسی نعمت جو ہم نے تمہیں عطا کی ہے اس کا شکر اسی مناسبت سے ادا کر سکو۔ میں نے بارہا مثال دی ہے کہ کسی بچے کے ہاتھ پر اگر ہیرا رکھ دیتے تو اس کے اندر کوئی جذبہ تشکر پیدا نہیں ہوگا۔ وہ تو سمجھے گا کہ یہ کالج کا کوئی گزرا ہے جو میرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے لیکن یہی ہیرا کسی جوہری کے ہاتھ پر رکھے جسے اس کی قدر و قیمت معلوم ہے تو اس کے اندر سے جو جذبات تشکر اٹھیں گے ان کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ تو جب آپ پر قرآن کی عظمت منکشف ہوگی تب ہی آپ اس نعمت کا اتنا شکر ادا کر سکیں گے جتنا کہ اس کا حق ہے۔ رمضان المبارک کا دو گونہ پروگرام عظمت قرآن کے انکشاف کے لیے رکھا گیا کہ دن میں روزہ رکھو تاکہ تمہیں کچھ تقویٰ کی پونجی حاصل ہو جائے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ اور رات کو قرآن کے ساتھ کھڑے رہو تاکہ قرآن مجید کی عظمت تم پر منکشف ہو اور اس کی عظمت کے انکشاف کے ساتھ تم اللہ کا شکر ادا کر سکو۔

عظمت قرآن بزبان قرآن

عظمت قرآن کا مضمون خود قرآن مجید میں بہت مرتبہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی خود تعریف کی ہے۔ بہت سی جہزیں ایسی ہیں جو ہم انسانوں کے لیے تو برائی کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو زبیب دیتی ہیں۔ جیسے تکبر بہت بڑی برائی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے بڑائی کو اپنی چادر اور عظمت کو اپنی ازار قرار دیا ہے: ﴿الْكِبْرِيَاءُ رَذَائِي وَالْعِظْمَةُ اِزَارِي﴾ (ابوداؤد المین ماجہ مسند احمد)۔ اُس کا نام اَلْمُتَكَبِّرُ ہے۔ یہ جامہ اسی کو راست آتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی کسی بات کی تعریف کریں تو یہ اچھی بات محسوس نہیں ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ خود اپنے کلام کی عظمت بیان کرتا ہے اور خود اس کی تعریف کرتا ہے۔ قرآن مجید کے وہ بے شمار مقامات جن میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کی عظمت بیان کی ہے ان میں سے پانچ مقامات میرے سامنے ایک عجیب ترتیب سے آئے ہیں جسے میں نے بارہا بیان بھی کیا ہے۔ اس وقت وہ میرا اصل موضوع نہیں

ہے صرف انہیں گنوا دینا کافی ہے۔ پہلے ایک آیت پھر دو آیتیں پھر چار آیتیں پھر آیتیں اور پھر آٹھ آیتیں اور ہر مقام کا اپنا ایک خاص مضمون ہے۔

عظمت قرآن کی ایک تمثیل

عظمت قرآن فی نفسہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام مکلم کی صفت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن اللہ کی صفت ہے اور ہم اس کی عظمت کا حصہ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن سورۃ الحشر میں فرمایا کہ ایک مثال سے ہم تمہیں کچھ تمہوڑا سا تصور دے سکتے ہیں:

﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لَضَرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۳۰﴾

”اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے۔ اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ غور و فکر کریں۔“

اور پہاڑ کے پھٹ جانے کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت موسیٰ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ پروے کی اوٹ سے ﴿مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ﴾ ہو رہا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے دیدار بھی حاصل ہو جائے۔ عرض کیا: ﴿رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ﴾ ”پروردگار! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔“ فرمایا: ﴿إِن تَرَانِي﴾ ”تم مجھے نہیں دیکھ سکتے“ ﴿وَلَكِنْ أَنْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي﴾ ”لیکن اس پہاڑ پر نظر جمادو“ (میں اس پر اپنی ایک جلی ڈالوں گا) پس اگر وہ (اسے برداشت کر جائے اور) اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا﴾ (الاعراف: ۱۳۳) ”چنانچہ جب اُس کے رب نے پہاڑ پر جلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔“ یہ بالواسطہ مشاہدہ تھا۔ حضرت موسیٰ نے پہاڑ پر اللہ کی جلی کا مشاہدہ کیا، لیکن اس کی تاب نہ لاسکے اور بے ہوش ہو کر گر

پڑے۔ اس سے ذرا عظمتِ قرآن کا اندازہ کیجیے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور جو اللہ کی ذات کی تجلی کا اثر ہے وہی اللہ کی صفت کی تجلی کا اثر ہے۔

افادیتِ قرآن کے چار پہلو

سورۃ الحشر کی ایک آیت کے بعد اب سورۃ یونس کی دو آیتیں ملاحظہ کیجیے۔ دیکھئے ایک ہے کسی شے کا اپنی جگہ عظیم ہونا اور ایک ہے اُس کی افادیت۔ تاج محل اپنی جگہ بڑا عظیم ہے لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ ہوا؟ تو قرآن کی عظمت فی نفسہ کیا ہے اس کا بیان تو سورۃ الحشر کی آیت میں آ گیا جبکہ اس کی افادیت کیا ہے اسے سورۃ یونس کی دو آیات میں بیان کر دیا گیا۔ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ
وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠١﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ لَبِئْسَ لَكَ لِقَاءُ حُورٍ
هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿١٠٢﴾﴾ (یونس)

”اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔ (آپ) کہہ دیجیے کہ بس لوگوں کو اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے۔ وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔“

یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے مَوْعِظَةٌ یعنی نصیحت ہے جس سے دل نرم ہو جائیں گے۔ جب دل نرم ہو جائیں گے تو یہ قرآن ان میں جذب ہو جائے گا اس طرح ساری باطنی بیماریوں کا علاج ہو جائے گا۔ تکبر، حسد، دنیا، حب مال، حب جاہ اور حب شہرت کا علاج ہو جائے گا۔ پھر یہ ہدایت ہے۔ یہ تمہیں رستہ بتائے گا کہ تمہیں کدھر جانا ہے، کدھر نہیں جانا۔ اور آخرت میں رحمت ہے۔ یہ قرآن کی چار افادیتیں ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ قرآن اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کا مظہر ہے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔ تو خوشیاں منانی ہوں تو اس کی مناد! اور جان لو کہ جو کچھ تم دنیا میں جمع

کرتے ہو ان سب چیزوں سے کہیں بڑھ کر قیمتی چیز یہ قرآن ہے۔

سورۃ الرحمن کی ابتدائی چار آیات

آگے چلے۔ سورۃ الرحمن کی پہلی چار آیات ملاحظہ کیجئے۔ ان چار آیتوں میں چار چوٹی کی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ ﴿الرَّحْمٰنُ﴾ یہ اللہ کے ناموں میں سب سے پیارا نام ہے۔ عرب اس نام سے واقف نہیں تھے۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۶۰ میں فرمایا گیا: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمٰنُ؟﴾ ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمن کو تو کہتے ہیں کہ رحمن کیا ہوتا ہے؟“ اللہ کو تو وہ جانتے تھے اسم ”اللہ“ ان کے ہاں ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا، لیکن ”رحمن“ سے ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے جس کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اللہ کی رحمت ہے اور ”رحمن“ میں وہ رحمت ٹھانٹیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ظاہر ہوتی ہے، جس میں جوش اور ہیجان ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سب سے پیارا نام رحمن ہے۔ آگے فرمایا: ﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ﴾ ”سکھلایا قرآن“۔ سارے علوم اللہ ہی نے سکھائے ہیں، چاہے مادی علوم ہوں، چاہے روحانی علوم ہوں، لیکن تمام علوم میں چوٹی کا علم قرآن کا علم ہے جو اللہ کی رحمانیت کا مظہر اتم ہے۔ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ﴾ ”پیدا کیا انسان کو“۔ اللہ تعالیٰ نے ہی تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ جنوں کو بھی اسی نے پیدا کیا، فرشتوں کو بھی اسی نے پیدا کیا۔ آسمان بنایا، زمین بنائی، پہاڑ بنائے، سورج، چاند، ستارے بنائے۔ کیا نہیں بنایا؟ لیکن جو کچھ اس نے بنایا ہے اس میں چوٹی کی مخلوق انسان ہے جو مجبور و ملائک ہے، خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ آگے فرمایا: ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ ”اسے بیان کی صلاحیت دی“۔ تو کیا دیکھنے کی صلاحیت نہیں دی؟ سننے کی صلاحیت نہیں دی؟ ظاہر ہے انسان کو تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ ہی نے عطا کی ہیں، لیکن انسان کی سب سے اونچی صلاحیت تو یہ بیان ہے۔ اسی لیے انسان کو حیوانِ ناطق کہتے ہیں۔ تو ان چار آیات میں چوٹی کی چار چیزیں بیان کر دی گئیں۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ جو سب سے اونچی صلاحیت ہے، یعنی بیان اس کو سب سے

اونچے علم ”قرآن“ پر صرف کرو۔ قرآن کو بیان کرو، قرآن کو عام کرو، قرآن کو پھیلاؤ۔ یہ نتیجہ حضور ﷺ نے ایک حدیث میں بیان کر دیا: عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))

”حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور اسے سکھائیں۔“ خود قرآن پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں۔ یہ قرآن کی اس نعمت کو عام کرنے کے لیے تشویق و ترغیب کا انتہائی خوبصورت انداز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے پیارا نام ”رحمن“ — اس نے جو علم انسان کو دیے اس میں چوٹی کا علم ”قرآن“ — اس نے جو کچھ بنایا ہے اس میں چوٹی کی تخلیق ”انسان“ — انسان کو جو صلاحیتیں دی ہیں ان میں چوٹی کی صلاحیت ”بیان“ — تو جیسے ہم کہتے ہیں توپ سے مکھی نہیں ماری جاتی، توپیں کسی اور کام کے لیے بنتی ہیں، اسی طرح تم اس قوت بیان کو دنیاوی چیزوں کے لیے صرف نہ کرو۔ دنیا کی چیزوں کی اللہ کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں۔ ساری دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے نزدیک چھڑ کے ایک پر کے برابر بھی نہیں۔ اسی قوت بیان کے زور پر ایک شخص عوامی مقرر اور لیڈر بن جاتا ہے، کوئی ڈکٹیٹر بن جاتا ہے، ہٹلر بن جاتا ہے، بھٹو بن جاتا ہے۔ اسی قوت بیان سے ایک وکیل ایک پیشی کے پانچ پانچ لاکھ روپے لے لیتا ہے۔ حالانکہ وہی قانون ان وکیلوں نے بھی پڑھ رکھا ہوتا ہے جو بے چارے جو تیاں پختارتے پھر رہے ہوتے ہیں اور انہیں کوئی اپنا وکیل نہیں کرتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ سرٹیفکیٹ attest کر کے تھوڑے سے پیسے کمالیتے ہیں۔ وہی قانون اے کے بروہی اور ایس ایم ظفر نے پڑھا ہے اور اپنی قوت بیان کے بل بوتے پر ایک مقام حاصل کیا ہے۔ تو اس قوت بیان کا اصل مصرف یہ ہے کہ اسے قرآن کے لیے استعمال کیا جائے۔

كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ

سورة الرحمن کی چار آیات کے بعد اب ملاحظہ کیجیے سورہ عبس کی چھ

آیات۔ فرمایا:

﴿كَلَّمَآ إِنهَآ تَذَكَّرَهٗ﴾ ۱۱ فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرَهٗ ۱۲ لِي صُحُفٍ مُّكْرَمَةٍ ۱۳ مَرْفُوعَةٍ

مُطَهَّرَةٍ ۱۴ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۱۵ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۱۶﴾

”یوں نہیں! یہ قرآن تو ایک فصاحت اور یاد دہانی ہے۔ جو چاہے اس سے یاد دہانی حاصل کر لے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو بہت بڑی عظمت ہیں۔ بہت بلند مقام کے حامل نہایت پاکیزہ ہیں۔ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو لائق تکریم اور پاک باز ہیں۔“

پہلی دو آیات میں فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ، یہ قرآن تذکرہ ہے یاد دہانی ہے۔ جو چاہے اس سے یاد دہانی حاصل کرے۔ یہ بہت اہم مضمون ہے۔ قرآن جس چیز کی طرف تمہیں بلا رہا ہے وہ تمہارے دل کے اندر موجود ہے۔ تم دنیا میں گم ہو گئے ہو اس لیے تمہیں پتا ہی نہیں کہ تمہارے پاس کتنا قیمتی ہیرا ہے۔ ہندی کا ایک بڑا پیارا دوہا ہے۔

بھیرکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گدڑی لال

گرہ کھول جانے نہیں اس بدیے کنگال

یعنی ”اے بھیک (شاعر کا نام) بھوکا اور محروم کوئی انسان بھی نہیں ہے ہر انسان کی گدڑی کے اندر لعل موجود ہے، لیکن جو گرہ لگی ہوئی ہے وہ کھولی نہیں جاسکتی اس لیے کنگال بن گئے ہیں۔“ پس تمہارے اندر تو سب کچھ ہے، لیکن ذہول ہے توجہ نہیں ہے۔ یہ قرآن یاد دہانی ہے۔ قرآن حکیم کے لیے خود قرآن میں الذکر الذکر اور تذکرہ جیسے الفاظ آئے ہیں۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَبِيدِ﴾ (ق) ”پس آپ قرآن کے ذریعے اسے یاد دہانی کرائیں جو میری تنبیہ سے ڈرے۔“ ایسے مقامات پر تعلیم کے بجائے تذکیر کا لفظ آتا ہے۔

اور یہ قرآن کتنی عظمت والا ہے؟ یہ لوح محفوظ میں ان صحیفوں میں درج ہے جو بہت محترم باعزت اور بڑی عظمت ہیں، بہت بلند مقام پر ہیں نہایت پاک ہیں ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو بہت ہی لائق تکریم اور پاک باز ہیں۔ یعنی یہ قرآن لوح محفوظ میں عالی مرتبت فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے۔

سورة الواقعة کی آٹھ آیات

اس کے بعد سورة الواقعة کی آٹھ آیات کا مطالعہ کر لیجیے:

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَرْقِعِ النُّجُومِ ﴿۱﴾ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّو تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ﴿۲﴾ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ﴿۳﴾ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ﴿۴﴾ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ﴿۵﴾ تَنْزِيلُ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶﴾ أَفَبِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُذْهِبُونَ ﴿۷﴾ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ ﴿۸﴾﴾

”پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کے مقام کی اور اگر تمہیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ بڑی عزت والا قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے جسے نہایت پاک مخلوق (فرشتوں) کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو، اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟“

ان آیات کا آغاز ایک بہت بڑی قسم سے ہوا۔ فرمایا: ”میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کے مقام کی۔ اور یہ قسم بہت بڑی ہے اگر تمہیں معلوم ہوتا۔“ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ کتنی بڑی قسم ہے۔ یہ تو وقت آئے گا تو پتا چلے گا۔ چنانچہ آج نزول قرآن کے چودہ سو سال بعد ہمارے علم میں آیا ہے کہ اس کائنات میں بلیک ہولز ہیں جو ستاروں کے سکر کر ختم ہو جانے کے نشانات ہیں۔ گویا ستارے ڈوب رہے ہیں ان کی موت واقع ہو رہی ہے۔ کائنات میں کہیں ایک خلا پیدا ہوتا ہے۔ اس خلا کے اندر جو دیکھو یہ ہے اس میں کھینچنے کی اتنی طاقت ہے کہ جو ستارہ اس کے قریب سے گزر جائے اسے کھینچ کر اس قبر میں دفن کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ جگہ جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔ فرمایا اگر تم جانتے تو یہ بہت بڑی قسم ہے جو ہم نے کھائی ہے۔ اور یہ عظیم قسم اس بات پر کھائی جا رہی ہے کہ یقیناً یہ بہت باعزت قرآن ایک چھپی ہوئی محفوظ کتاب میں درج ہے جسے کوئی چھو ہی نہیں سکتا، مگر نہایت پاک مخلوق یعنی فرشتے۔ یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ لوح محفوظ سے اس کی تزیل ہو رہی ہے محمد رسول

اللہ ﷻ پر۔ وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے جو یہ نازل ہو رہا ہے، یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

اس کے بعد ڈاٹ کا انداز ہے: ﴿أَفِيْهِذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّذْهِبُوْنَ﴾ ”پھر کیا اس کلام سے تم لا پورا ہی برت رہے ہو؟“ اور اہل انکاری کر رہے ہو؟ تم نے انگریزی پڑھ لی دنیا کی دوسری زبانیں سیکھ لیں، لیکن اتنی عربی نہیں پڑھی کہ ہمارے کلام کو سمجھ سکو۔ ڈاکٹری پڑھ لی اور اس میں بیس سال لگا دیے۔ انجینئرنگ میں اٹھارہ سال لگا دیے، لیکن اتنا وقت نہ نکال سکے کہ عربی پڑھتے اور قرآن کو براہ راست اپنے قلب کے اندر اتارتے؟ ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنْتُمْ تَكْفِيْبُوْنَ﴾ ”اور اپنا حصہ تم نے بس یہی رکھا ہے کہ اسے جھلاتے پھرو؟“ قرآن کے ساتھ تمہاری بے اعتنائی کا یہ طرز عمل اس کی تکذیب کے مترادف ہے۔ اگر تم اسے اللہ کا کلام مانتے تو یہ بے اعتنائی اور یہ بے توجہی ہو سکتی تھی؟ قطعاً نہیں!

عظمت قرآن کے ضمن میں میں نے پانچ مقامات آپ کو گوائے ہیں، جن کے درمیان بڑی حسین ترتیب بن گئی ہے۔ پہلے ایک آیت پھر دو آیتیں پھر چار آیتیں پھر چھ آیتیں اور پھر آٹھ آیتیں۔ پہلی آیت میں اللہ کے کلام کی عظمت بیان ہوئی ہے جیسے کہ وہ ہے۔ دوسرے مقام پر قرآن کی عظمت اس کے آدے کے لحاظ سے بیان ہوئی ہے۔ تیسرے مقام میں اس کو عام کرنے کی ترغیب و تشویق ہے۔ چوتھے مقام میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں تذکرہ اور یاد دہانی ہے، کوئی نئی نئی بات نہیں ہے، تمہاری فطرت میں ہدایت موجود ہے، جسے وہاں سے یہ قرآن نکال کر تمہارے سامنے لاتا ہے۔ اور پھر پانچویں مقام پر فرمایا گیا کہ یہ کتاب کون کون میں ثبت ہے، جہاں اسے کوئی چھو ہی نہیں سکا سوائے فرشتوں کے جو نہایت پاک باذن اللہ ظہر ہیں۔ اس آیت سے ضمنی طور پر یہ فقہی مسئلہ بھی نکالا گیا ہے کہ آپ قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتے اگر آپ ہاوضہ ہوں۔

﴿لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ کا ایک تیسرا مطلب بھی ہے۔ دیکھئے ایک ہے اس قرآن کا گودا اور مخزن، جبکہ ایک اس کا چھلکا ہے۔ تذکرہ بالا الفاظ قرآنی سے یہ

بات مستبط ہوتی ہے کہ جن لوگوں کا اندر پاک نہیں ہو چکا، جن لوگوں کا تزکیہ نفس نہیں ہو چکا، وہ اس کے چھلکے ہی کے ساتھ کھیلتے رہیں گے، اس کے مغز تک اُن کی رسائی نہیں ہوگی، چاہے وہ کہنے کو مفسر بن جائیں، جلدیں کی جلدیں لکھ دیں۔ غلام احمد پرویز نے ”مفہوم القرآن“ لکھ دی، غلام احمد قادیانی آنجمانی کے بیٹے نے تفسیر کبیر بھی لکھی تفسیر صغیر بھی، لیکن قرآن کے مغز تک ان حضرات کی رسائی نہیں ہوئی۔ مولانا روم نے یہ بات اپنے ایک شعر میں بیان کی ہے، اگرچہ انداز اچھا نہیں ہے، لیکن بہت گہری بات کہی ہے۔

ما ز قرآن مغزاً برداشتم
استخوان پیش رساں انداشتم

یعنی ہم نے قرآن سے اس کا مغز حاصل کر لیا ہے، ہڈی کا گو دا تو ہم نے لے لیا ہے اور جو ہڈی تھی وہ کتوں کے آگے ڈال دی ہے۔ تو انسان قرآن کے مغز تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کا باطن پاک نہ ہو۔

عظمت قرآن احادیث نبوی کے آئینے میں

میری آج کی گفتگو کا موضوع ”عظمت قرآن بلسان نبوت“ ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی عظمت کو کس طرح بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث تو میں بیان کر چکا ہوں:

((عَبِّرْكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))

”تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے۔“

یہ حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح بخاری کی ہے۔

دوسری حدیث جو میں آپ کو بظاہر ہوں یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور مسلم شریف کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ الْأُخْرَى))

”اللہ تعالیٰ اسی کتاب کے ذریعے سے کچھ قوموں کو بام عروج تک پہنچائے گا اور اسی کو ترک کرنے کے باعث کچھ کو ذلیل و خوار کر دے گا۔“

اس حدیث کو جس قدر اہمیت علامہ اقبال نے دی ہے میرے علم کی حد تک کسی اور نے نہیں دی۔ اس حدیث کا مفہوم اقبال اپنے شعر میں یوں بیان کرتے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر

اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

کہ وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر نکلے تھے اور دنیا پر چھا گئے تھے اور تم اسی قرآن کو چھوڑ کر ذلیل و رسوا ہو گئے ہو! اور اسی مضمون کو علامہ نے فارسی میں کس قدر خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

خوار از مجوری قرآن شدی

شکوہ سچ گردشِ دوراں شدی!

کہ اے امت مسلمہ! تو قرآن کو ترک کرنے کے باعث ذلیل و خوار ہوئی ہے لیکن تو گردشِ دوراں کا شکوہ کر رہی ہے اور اپنے زوال کا سبب ”فلک کج رفتار“ کو قرار دے رہی ہے حالانکہ فلک تو کسی قوم کی قسمت نہیں بدلتا۔ اپنی ذلت و رسوائی کے ذمہ دار تم خود ہو۔

اے جو شبنم بر زمیں بھندہ

در بغل داری کتاب زندہ

اے وہ امت جو شبنم کی طرح زمین پر پامال پڑی ہوئی ہے اور لوگ تجھے اپنے پاؤں تلے روند رہے ہیں! اگر اب بھی تم بلندی چاہتے ہو تو جان لو کہ تمہاری بغل میں ایک زندہ کتاب (قرآن مجید) موجود ہے۔

فقتوں سے بچاؤ کا راستہ

اب جو حدیث میں آپ کو سنانے جا رہا ہے یہ کلام نبوت کی فصاحت و بلاغت اور عذوبت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ کلام کی فصاحت یہ ہوتی ہے کہ کلام واضح ہو سمجھ میں

کوئی دھماکہ ہو جائے یا آگ لگ جائے یا کوئی اور ایمر جنسی کی صورت پیش آ جائے تو ہاں میں موجود لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے ان راستوں کی طرف بھاگیں۔ عرب ممالک میں EXIT کی جگہ ”مَنجُوح“ لکھا ہوتا ہے۔ لسان نبوت سے فتنے کی خبر سننے ہی حضرت علیؑ نے اس سے بھاؤ کے لیے مَنجُوح کا پوچھا کہ اس فتنے سے نکلنے کا راستہ کون سا ہوگا؟ اس میں جو بات میرے اور آپ کے لیے قابل غور ہے وہ ہمارے اور صحابہ کرامؓ کے طرز عمل کا بنیادی فرق ہے۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو پوچھتے حضورؐ کیا فرماتے؟ کیا ہوگا؟ کب آئے گا؟ کدھر سے آئے گا؟ کیوں آئے گا؟ حالانکہ ان سب سوالات کا عملی ناکارہ کیا ہے۔ یہ تو سب معلومات ہیں۔ حضرت علیؑ نے بڑا عملی سوال پوچھا کہ اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟ رسول اللہؐ نے اس کا جو جواب ارشاد فرمایا اس پر توجہ کیجیے۔ قَالَ: ﴿بِحُكْمِ اللَّهِ﴾ آپ نے فرمایا: ”اللہ کی کتاب!“ فتنوں سے نکالنے والی شے اللہ کی کتاب ہوگی!

جنگ صفین میں جب حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی تجویز کے تحت قرآن نیزے پر اٹھا دیا گیا کہ لڑنے جھگڑنے کا قاعدہ نہیں ہے اور قرآن ہمارے مابین فیصلہ کرے گا تو حضرت علیؑ جنگ بندی پر تیار ہو گئے۔ حالانکہ آپ کے ساتھیوں میں سے بڑی تعداد نے کہا کہ علیؑ دھوکہ کھا گئے۔ بلکہ خوارج نے تو (معاذ اللہ) حضرت علیؑ کو کافر اور واجب القتل قرار دے دیا۔ لیکن حضرت علیؑ قرآن کو حکم کیسے نہ مانتے؟ انہیں تو رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ فتنے سے نکلنے کا راستہ قرآن ہے۔ میاں بیوی میں چھٹکشی اس حد تک بڑھ جائے کہ تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ: ﴿فَاتَّبِعُوا حُكْمًا مِّنْ أَهْلِهَا وَحُكْمًا مِّنْ أَهْلِهَا﴾ (النساء: ۳۵) یعنی ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک حکم عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کیا جائے۔ چنانچہ حضرت علیؑ اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں نے اپنی اپنی جانب سے ایک ایک حکم مقرر کر دیا۔ حضرت علیؑ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو حکم مقرر کیا۔ بعض لوگ اسے حضرت

علی کی سیاسی غلطی کہتے ہیں لیکن حضرت علیؑ کے پیش نظر یہ حدیث ہوگی کہ فتنے سے نکلنے کا راستہ قرآن ہے۔

قرآن: ماضی حال اور مستقبل کا آئینہ

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی مدح جس انداز میں بیان فرمائی ہے یہ کلام نبوی کی فصاحت و بلاغت اور عذوبت کی بہترین مثال ہے۔ فرمایا: ((فِيهِ نَبَأٌ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبْرٌ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمٌ مَا بَيْنَكُمْ)) ”اس قرآن میں خبریں ہیں ان کی جو تم سے پہلے گزر گئے (یعنی قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم شعیب، آل فرعون) اور اس میں خبر ہے تم سے بعد والوں کی بھی اور تمہارے مابین جو اختلافات ہو جائیں ان کا فیصلہ بھی اس کے اندر ہے۔“ ((وَخَبْرٌ مَا بَعْدَكُمْ)) کے حوالے سے میں قرآن مجید کے تین مقامات سے دس آیتیں بارہا بیان کر چکا ہوں جو آج کے پاکستان کا نقشہ کھینچ رہی ہیں۔ قرآن میں پاکستان کا ذکر موجود ہے۔ پاکستان کیسے بنا، اس کا بھی ذکر ہے۔ پھر پاکستان حاصل کر کے ہم نے بحیثیت قوم کیا وطنہ اختیار کیا، اس کا بھی ذکر ہے اور اب اس کا کیا انجام ہونے والا ہے اس کا بھی ذکر ہے۔ سورۃ الانبیاء میں الفاظ آئے ہیں: ((لَقَدْ اَنْزَلْنَا لِيْلِكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ - اَفَلَا تَنْفَلِحُوْنَ ۝۱۰)) ”(لوگوا) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟“

فیصلہ کن کتاب

آگے فرمایا: ((هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ)) ”یہ قرآن ایک فیصلہ کن کتاب ہے، یادہ گوئی نہیں ہے۔“ یہ شاعروں کی شاعری نہیں ہے۔ یہ تو قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے کرنے والی کتاب ہے۔ حضرت عمرؓ والی روایت کے مطابق اب قوموں کی تقدیر کے فیصلے اس قرآن سے ہوں گے۔ اگر کوئی قوم ابھرے گی تو قرآن لے کر ابھرے گی اور گرے گی تو قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے گرے گی۔ یہاں آپ کسی مغالطے کا شکار نہ ہو جائیں، مغرب (West) ابھرا ہے تو وہ بھی قرآن کی وجہ سے ابھرا

ہے۔ نوٹ کر لیجیے 'اقبال' نے یہ کہا ہے:

"The inner core of the Western Civilization is
Quranic."

"مغربی تہذیب کا باطن قرآنی ہے۔"

قرآن نے انسان کو توہمات سے نجات دلائی ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ
آنکھوں سے کام لو، کانوں سے کام لو، دیکھو، مشاہدہ کرو۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

یہ بات مستشرقین بھی تسلیم کرتے ہیں اور مغربی مفکرین بھی کہ حقیقتاً دنیا میں توہمات کو ختم
کرنے والی اور انسان کے عمل کو علم کی بنیاد پر استوار کرنے والی کتاب قرآن مجید
ہے۔ اسلام سے قبل علم کی بنیاد ارسطو کی استخراجی منطق (deductive logic) پر
تھی۔ اسی سے تھیوں پر تھیں بن بھی رہی تھیں اور سلجھ بھی رہی تھیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ
سلجھتی کم، الجھتی زیادہ تھیں۔ اسلام نے آ کر انسان کو منطق کی اس تنگ نائے سے نکالا
اور اسے استقراء (induction) کی طرف متوجہ کیا کہ اللہ نے تمہیں سماعت دی ہے
تاکہ سنو، بصارت دی ہے تاکہ دیکھو، تمہیں تفکر و تعقل کی استعداد دی ہے تاکہ غور و فکر
اور سوچ بچار کرو۔ تمہیں استنباط، استدلال اور استنتاج کی صلاحیتیں عطا کی گئی
ہیں۔ یہ روح عصر ہے اور اس روح عصر کا آغاز کرنے والا قرآن ہے۔ یورپ نے
اسی کو اختیار کیا اور وہ بام عروج پر پہنچ گئے۔ اگرچہ اس میں انہوں نے بہت سی ٹھوکریں
بھی کھائی ہیں، وہ ایک علیحدہ مضمون ہے، لیکن مغربی تہذیب کے باطن (inner
core) کے بارے میں علامہ کہتے ہیں کہ یہ قرآنی ہے۔ البتہ اس کے ظاہر کے بارے
میں اقبال نے "The dazzling exterior" کے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ یہ
بڑی چکا چوند کا حامل ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب کا حاضر کی
یہ صنایع مگر جھوٹے رنگوں کی ریزہ کاہلی ہے

ہمارے نوجوان یورپ اور امریکہ میں جا کر اسی ظاہری چکا چوند سے مہبوت ہو جاتے ہیں، لیکن علامہ کہتے ہیں۔

خبرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ حجاز و حولِ قدس!

اس شعر کے دوسرے مصرع میں میں نے کچھ لفظی تصرف کیا ہے۔ بہر حال قرآن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”یہ ایک فیصلہ کن کتاب ہے، یا وہ گوئی نہیں ہے“۔ سورۃ الطارق میں الفاظ آئے ہیں: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ فَضْلٍ ﴿۱﴾ وَمَا هُوَ بِالنُّزُولِ ﴿۲﴾﴾ ”بے شک یہ قرآن دونوں فیصلہ کرنے والا کلام ہے، یہ ہنسی کی اور بے فائدہ بات نہیں ہے“۔ یہی بات رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث مبارک میں ارشاد فرمائی۔

حدیث کے اگلے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ دیکھیے فصاحت، بلاغت اور عذوبت کے ساتھ ساتھ ان الفاظ میں کس قدر غنائیت ہے۔ فرمایا: ((مَنْ تَوَكَّأَ مِنْ جَبَّارٍ فَصَمَهُ اللَّهُ)) ”جو شخص اپنے تکبر کی وجہ سے اس قرآن کو ترک کر دے گا اللہ اسے پس کر رکھ دے گا“۔ اگرچہ قرآن کو ترک ہم نے بھی کیا ہے لیکن تکبر کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے کیا ہے۔ قرآن ترک کرنے کے مجرم تو ہم بھی ہیں، لیکن ہم نے قرآن کے خلاف تکبر نہیں کیا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جو کوئی جاہر و سرکش اپنی سرکشی کے قہر اور جوش میں آ کر اور طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر قرآن کو ترک کرے گا اللہ اسے پس کر رکھ دے گا۔

ہدایت کا سرچشمہ

((وَمِنْ ابْتغَى الْهُدَىٰ فِي غَيْبِهَا أَضَلَّهُ اللَّهُ)) ”اور جو کوئی قرآن کے سوا کسی اور شے میں ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا“۔ فلسفہ سے آپ ہدایت لینا چاہتے ہیں تو لازماً ناکام ہوں گے۔ مولانا ظفر علی خان کا شعر آپ کو یاد ہوگا

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے

ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سپاروں میں

اور علامہ اقبال مشرق و مغرب کے فلسفے کا نکال چکنے کے بعد کس کرب سے کہتے ہیں۔

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب

مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب

وہ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فلسفہ تو کھجور کا ایسا بانجھ درخت ہے جس پر کھجور لگتی ہی نہیں لہذا مجھے اس سے کچھ نہیں ملا۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں

میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!

تو ثابت ہوا کہ فلسفہ ہدایت کا ذریعہ نہیں ہے۔ اسی طرح سائنس بھی ذریعہ ہدایت نہیں

ہے۔ سائنس تو آلات ایجاد کرنے کا ذریعہ ہے۔ سائنس تو توانائی کے سرچشمے تلاش

کرنے اور قدرتی طاقتوں کو دریافت کرنے کا ذریعہ ہے۔ توانائی (energy) کا سب

سے پہلا ذریعہ جو انسان نے دریافت کیا وہ آگ ہے اور وہ اتفاقاً انسان کے علم میں

آگئی ہوگی۔ ہزاروں سال قبل کسی انسان نے دیکھا کہ ایک چٹان اوپر سے گرنے لگی ہے

چٹان تھکی دونوں کے گرانے سے شعلہ نکلا۔ اب اس نے اس مشاہدے کی بنیاد پر خود تجربہ

کیا اور دو پتھر لے کر خوب زور سے گمائے تو شعلہ نکل آیا۔ لیجیے آگ ایجاد ہوگئی۔ اس

سے پہلے انسان کچا گوشت کھاتا تھا اس کے علاوہ پھل کھاتا تھا درختوں کی جڑیں کھاتا تھا

۔ آگ کی دریافت کے بعد انسان نے گوشت کو بھون کر اور پکا کر کھانا شروع کر دیا۔

اسے اولین سورس آف انرجی مل گئی۔ پھر کسی سائنس دان نے دیکھا کہ ایک ہاضمی

چولہے کے اوپر چڑھی ہوئی ہے اور اس کا ڈھکتا ہل رہا ہے۔ اس نے سوچا اس کو کون ہلا

رہا ہے؟ کیا کوئی جن بھوت ہے؟ معلوم ہوا کہ اندر بھاپ (steam) پیدا ہو رہی ہے

اور بھاپ میں اس قدر طاقت ہے کہ وہ اسے ہلا رہی ہے۔ اس طرح توانائی کا ایک

ذریعہ بھاپ دریافت ہوگئی اور اس سے بڑا کام لیا گیا۔ کبھی سٹیم کے انجن چلتے تھے جو

بڑے ہیبت ناک اور دیوبہل ہوا کرتے تھے۔ فرنیئر میل کا انجن دیکھ کر خوف آتا تھا۔

انسانی قد سے زیادہ تو اس کے پیسے کا گھیرا تھا۔ یہ سٹیم چلتے تھے۔ پھر بجلی ایجاد ہوگئی۔

تو سائنس سے ہدایت نہیں ملتی۔ اس سے تو آپ کو کچھ چیزوں کے استعمال کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ ہدایت صرف قرآن سے ملے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو کوئی قرآن کے سوا کہیں اور سے ہدایت ڈھونڈے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا۔

اللہ کی مضبوط رستی

آگے پھر حدیث کے تین کلمے فصاحت و بلاغت اور عزوبت و غنایت کی بہترین مثال ہیں۔ فرمایا: ((وَهُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ، وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ)) شاعری نہیں ہے لیکن آزاد شاعری سے ملتا جلتا انداز ہے۔ ((وَهُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ)) ”یہی ہے اللہ کی مضبوط رستی“۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں ارشاد ہوا: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ ”اللہ کی رستی کو مل جل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقے میں مت پڑو“۔ لیکن وہ اللہ کی رستی کون سی ہے؟ اسے قرآن میں واضح نہیں کیا گیا بلکہ اس کی صراحت حدیث سے ہوتی ہے۔ حدیث سے ناواقف لوگ ایسی آیات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ۱۹۷۲ء میں پاکستان میں عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس ہو رہی تھی تو جگہ جگہ اس آیت کے بیڑے لگے ہوئے تھے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾۔ ہر رکشا اور ٹیکسی پر بھی یہی آیت لکھی ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں اپنی ایک کتاب کی طباعت کے سلسلے میں مکتبہ جدید پریس گیا تو وہاں آزاد کشمیر حکومت کے محکمہ اطلاعات کے سربراہ آئے ہوئے تھے جو کیونٹ تھے۔ انہوں نے بڑی دہلیدہ دہنی سے کہا کہ یہ کیا مہمل کلام ہے؟ کہاں ہے اللہ کی رستی جسے مل کر تھامنا ہے؟ کہاں لگی ہوئی ہے وہ رستی؟ دکھاؤ مجھے! یہ اصل میں حدیث سے ناواقفیت ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید میں اگر کوئی شے تشریح طلب ہو تو اس کو واضح کرنا حضور ﷺ کا فرض منہی ہے۔ مگر میں حدیث تو حضور ﷺ کا یہ حق بھی تسلیم نہیں کرتے جبکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ آپ کا فرض منہی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (انحل: ۴۴) ”اور (اے نبی!) ہم نے آپ پر یہ ذکر (قرآن حکیم) نازل کیا تاکہ آپ واضح کر دیں اس کو

لوگوں کے لیے جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔“ تو آپ نے واضح فرمادیا کہ: ((وَهُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ)) ”یہ (قرآن) اللہ کی مضبوط رسی ہے۔“ اس کو پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ اِنْ اِعْتَصَمْتُمْ بِهِ كِتَابُ اللَّهِ)) (مسلم)

”اور میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑ لو گے تو اس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے وہ کتاب اللہ ہے۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

((كِتَابُ اللَّهِ حَبْلٌ مَمْدُودٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ)) (الترمذی)

”اللہ کی کتاب (کو تھامے رکھنا) جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ایک رسی ہے۔“

اس ضمن میں ایک اور حدیث بڑی ہی پیاری ہے۔ حضور ﷺ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے دیکھا کہ مسجد کے ایک کونے میں کچھ لوگ بیٹھے قرآن مجید کا مذاکرہ کر رہے ہیں سمجھ رہے ہیں سمجھا رہے ہیں تو آپ کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار ظاہر ہوئے آپ ان کے پاس تشریف لائے اور پوچھا: ((الَسْتُمْ تَشْهَدُونَ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللَّهُ وَانِّي رَسُولُ اللَّهِ وَهَذَا الْقُرْآنُ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ؟)) ”کیا آپ لوگ اس کے گواہ نہیں ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟“ سب صحابہ نے کہا: ((بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ)) ”کیوں نہیں اے اللہ کے رسول!“ ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اب آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَاَسْتَبْشِرُوا فَاِنَّ الْقُرْآنَ طَرَفُهُ بِيَدِ اللَّهِ وَطَرَفُهُ بَايْدِيكُمْ)) ”میں تم خوشیاں مناؤ اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سر تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

قرآن پر حکمت ذکر

زیر مطالعہ حدیث میں آگے فرمایا: ((وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ)) ”اور یہی بد حکمت

ذکر ہے۔ قرآن اپنے آپ کو ”الذکر“ کہتا ہے، لیکن تم نے ذکر کے بت نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ سب سے مضبوط اور مستحکم ذکر یہ قرآن ہے، لیکن اس پر توجہ ہی نہیں جبکہ ذکر وادکار اور اوراد و وظائف کے مجموعے توجہات کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

دعا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((الدُّعَاءُ مَعُ الْعِبَادَةِ)) (ترمذی) یعنی ”دعا عبادت کا جوہر ہے“۔ بلکہ یہاں تک فرمایا: ((الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (ترمذی) یعنی ”دعا ہی تو عبادت ہے“۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِي وَمَسْأَلَتِي أَعْطَيْتُهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِيَ السَّائِلِينَ)) ”جو شخص قرآن کی تلاوت اور درس و تدریس کی مصروفیت کی وجہ سے میرا ذکر نہ کر سکے اور مجھ سے دعا نہ کر سکے میں اُسے اس شے سے افضل عطا کرتا ہوں جو میں دعا کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں“۔ اس حدیث کے اگلے الفاظ ہیں: ((وَأَفْضَلُ كَلَامِ اللَّهِ عَلَى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللَّهِ عَلَى خَلْقِهِ)) (ترمذی) ”اور اللہ کے کلام کو جملہ کلاموں پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی خود اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر“۔

قرآن: صراطِ مستقیم

زیر مطالعہ حدیث کے اگلے الفاظ ہیں: ((وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ)) ”اور یہی صراطِ مستقیم ہے“۔ نماز کی ہر رکعت میں ہم ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرتے ہیں۔ اس حدیث میں صراحت آگئی کہ صراطِ مستقیم یہی قرآن ہے۔

((هُوَ الَّذِي لَا تَرِيغُ بِهِ الْإِكْهَاءُ)) ”یہ وہ شے ہے جس کے ہوتے ہوئے خواہشات نفس (تمہیں) گمراہ نہیں کر سکیں گی“۔ اس قرآن سے رابطہ ہوگا تو خواہشات نفسانی میڑھے رُخ نہیں لے جا سکیں گی۔

((وَلَا تَلْبَسُ بِهِ الْأَلْبَسَةُ)) ”اور زبانیں اس میں گڑبڑ نہیں کر سکیں گی“۔ اس کے ساتھ سابقہ آسمانی کتابوں والا معاملہ کرنا ممکن نہیں ہوگا کہ ذرا سا زبان کو مروڑ کر

پڑھا تو کچھ کا کچھ بن گیا۔ اس طرح اُن کتابوں میں تحریف ہو گئی۔ قرآن حکیم میں اس طرح کی تحریف کے سارے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو متوجہ کرنے کے لیے جو لفظ ”رَاعِنَا“ استعمال ہو رہا تھا، مسلمانوں کو اس سے بھی روک دیا گیا۔ رَاعِنَا کا مطلب ہے ذرا ہماری رعایت کیجیے ہمارا لحاظ کیجیے میں آپ کی بات سمجھا نہیں ہوں آپ دوبارہ سمجھا دیجیے۔ لیکن یہود نے اسے زبان مروڑ کر ”رَاعِنَا“ کہنا شروع کر دیا تو اس لفظ کے استعمال سے روک دیا گیا۔ قرآن میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کو توڑ مروڑ کر کہیں کا کہیں پہنچایا جاسکے۔ قرآن اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ ”اس پر باطل حملہ آور ہو ہی نہیں سکتا نہ سامنے سے نہ پیچھے سے۔“

بے مثل و بے مثال کتاب

((وَلَا يَسْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) ”اور علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہو سکیں گے۔“ سیر ہونا کس کو کہتے ہیں؟ آپ نے کھانا اتنا کھا لیا کہ پیٹ بھر گیا اور آپ سیر ہو گئے۔ اب آپ کے سامنے کوئی بہترین ڈش بھی لے آئے اور تمہوڑا سا کھانے کی فرمائش کرے تو آپ کی طبیعت آمادہ نہیں ہوگی اس لیے کہ آپ سیر ہو چکے ہیں۔ لیکن قرآن کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہوں گے۔ اس پر غور کرتے رہیں تدبر کرتے رہیں پڑھتے رہیں لیکن قرآن سے سیر نہیں ہوں گے۔ یہ اس کا اعجاز ہے۔

((وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّوَدِ)) ”اولو کثیرا تلاوت سے اس پر کوئی باسی پن طاری نہیں ہوگا۔“ دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے۔ آپ نے کوئی کتاب ایک دفعہ پڑھی تو اب دوسری دفعہ پڑھنے کو جی نہیں چاہے گا۔ اور اگر دوسری دفعہ پڑھ لی تو اب اسے دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہے گا۔ لیکن یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اسے پڑھتے رہتے پڑھتے رہتے سیکڑوں دفعہ پڑھا جائیے ہر دفعہ آپ کو نئی چیزیں ملیں گی نئے نئے نکتے ملیں گے۔ امام شافعی اصول فقہ کے امام تھے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ فقہ کے چار ماخذ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کے لیے قرآن سے دلائل جمع کر رہے تھے لیکن

اجماع کے لیے انہیں قرآن سے کوئی دلیل نہیں مل رہی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے تین سو مرتبہ شروع سے آخر تک قرآن پڑھا، لیکن دلیل نہیں ملی۔ اس کے بعد جب تین سو ایک مرتبہ پڑھ رہے تھے تو سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ کے ان الفاظ پر توجہ مرکز ہو گئی:

﴿.....وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ اور جو کوئی مسلمانوں کے راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو ہم اس کو اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔ مسلمانوں کا راستہ وہ ہے جس پر مسلمانوں کا اجماع ہو جائے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں آیا ہے: ((إِنَّ أُمَّتِي لَا تَجْتَمِعُ عَلَىٰ ضَلَالَةٍ)) (ابن ماجہ) ”یقیناً میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔“

جواہر علم و حکمت کا لامتناہی خزانہ

((وَلَا تَنْقُضِي عَهَابِيَّةً)) ”اور اس کے عہد نامہ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔“ یہ وہ کان ہے جس میں سے علم و حکمت کے گوہر نایاب ہمیشہ نکلتے رہیں گے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ حدیث مبارک کا یہ ٹکڑا بہت اہم ہے۔ ہم نے عام طور پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ قرآن کی تفسیر و تشریح میں جو کچھ اسلاف لکھ چکے وہ حرف آخر ہے۔ یہ تصور غلط ہے کیونکہ قرآن اتنا محدود نہیں ہے۔ ہیروں کی ایک کان سے آپ ہیرے نکالتے رہیں تو ایک وقت آئے گا کہ معلوم ہوگا کان خالی ہو گئی۔ لیکن قرآن ایسی کان نہیں ہے جو کبھی خالی ہو جائے۔ اس میں سے ہیرے نکلتے رہیں گے۔ اس میں غور و فکر اور تدبر کے نتیجے میں علم و حکمت کے موتی ہمیشہ نکلتے رہیں گے۔ بقول اقبال۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم

حکمت او لا یزال است و قدیم

خاص طور پر جدید سائنس جیسے چمچے ترقی کرے گی قرآن میں سے نئے نئے ہیرے نکلتے چلے آئیں گے۔ سورۃ حم السجدۃ کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ لَيُبَيِّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ﴾ ”ہم عنقریب اپنی نشانیاں

لوگوں کو دکھائیں گے آفاق میں بھی اور ان کے اپنے اندر بھی یہاں تک کہ یہ بات بالکل مبرہن ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔ چنانچہ آج کے سائنس دان انگشت بدنداں ہیں کہ چودہ سو برس پہلے یہ بات قرآن نے کہی ہے جو ہم پر آج کھلی ہے جبکہ نہ مائیکروسکوپ کا وجود تھا نہ dissection کا معاملہ تھا اور ماں کے پیٹ میں جنین کی نشوونما کے تمام مراحل قرآن نے کس قدر صراحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ البتہ جہاں تک فقہی و شرعی احکام کا تعلق ہے اس ضمن میں آپ پیچھے کی طرف چلیں۔ اسلاف کی بات سنیں پھر ان کے بھی اسلاف کی بات سنیں۔ فقہائے متاخرین کا نقطہ نظر معلوم کر لیا ہے تو حقدارین کا نقطہ نظر معلوم کریں۔ ان سے بھی پیچھے جائیں اور صحابہ کرام کے پاس پہنچ جائیں۔ ان سے بھی پیچھے جائیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں سر رکھ دیں۔ جیسے اقبال نے کہا ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ اوست رسیدی تمام یوہی است

”اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں تک پہنچاؤ کیونکہ دین تو نام ہی ان کا

ہے۔ اگر وہاں تک نہیں پہنچو گے تو یہ سراسر یوہی ہی ہے۔“

جنات کا قبول اسلام

((هُوَ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذِ الْجِنَّ اِذْ سَمِعَتْهُ حَتَّىٰ قَالُوْا: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا))

”یہ وہ کتاب ہے کہ اسے جیسے ہی جنوں نے سنا فوراً پکار

اٹھے: ہم نے ایک بہت خوبصورت قرآن سنا ہے جو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی

کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔“ ہمارا حال یہ ہے کہ سیکلز و مرتبہ سنتے ہیں مگر

ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے چکنے گزے کے اوپر سے پانی بہ جائے۔ اور جنوں کی

جماعت نے اسے ایک مرتبہ سنا تو وہ اس پر ایمان لے آئی۔ اس واقعہ کا ذکر سورۃ الجن

کے آغاز میں ہے۔ جبکہ سورۃ الاحقاف میں بتایا گیا ہے کہ یہ جنات ایمان لانے کے

بعد اپنی قوم کے پاس گئے تو جاتے ہی دعوت و تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے اپنی قوم کو

بتایا کہ ”ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی رہنمائی کرتی ہے حق اور رشد و ہدایت کی طرف“۔ پھر انہوں نے اپنی قوم کو رسول اللہ ﷺ کی پکار پر ایمان لانے کی دعوت دی: ﴿يَقُولُوا مَا آجِبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمَنُوا بِهِ.....﴾ ”اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ.....“

حدیث کا کلائمکس

حدیث کے آخری ٹکڑے اس حدیث کا کلائمکس ہیں۔ فرمایا: ((مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ أَجْرٌ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدْلٌ وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدًى إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ)) ”جس نے قرآن کی بنیاد پر بات کہی اُس نے سچ کہا اور جس نے قرآن پر عمل کیا اس کا اجر محفوظ ہے اور جس نے قرآن کی بنیاد پر کوئی فیصلہ دیا اس نے عدل کیا اور جس نے قرآن کی طرف بلایا اُسے تو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دی گئی“۔ کسی اور کو ہدایت حاصل ہو یا نہ ہو یہ داعی کے ذمے نہیں ہے البتہ جو قرآن کی طرف بلا رہا ہے اس کی ہدایت یقینی (insured) ہے۔

دعوت الی القرآن کلمۃ عا

اب جان لیجئے کہ دعوت الی القرآن کا مطلب کیا ہے۔ لوگوں سے یہ کہنا کہ قرآن پڑھو اور پھر انہیں قرآن پڑھانا لوگوں کو دعوت دینا کہ قرآن سمجھو اور پھر انہیں سمجھانا دعوت الی القرآن ہے۔ دعوت الی القرآن کا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی قرآن پر عمل کرو اور اجتماعی زندگی میں بھی اسے ایک نظام کی حیثیت سے قائم کرو۔ یہ بھی دعوت الی القرآن ہے کہ اس قرآن کو پہنچاؤ دنیا کے ایک ایک انسان تک۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کو پوری لوح انسانی کے لیے بھیجا گیا تھا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَلِمَةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ (سبأ: ۲۸) اور خطبہ حجۃ الوداع میں آپ نے کہہ دیا تھا کہ دیکھو میں نے تمہیں پہنچا دیا: ﴿فَلْيَسْمَعِ الشَّاهِدُ الْغَائِبِ﴾ (متفق علیہ) ”اب جو موجود ہیں وہ ان کو پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں“۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس عظیم

مشن کو لے کر پوری دنیا میں پھیل گئے۔ ہم مدینے کی گلیوں کی بات کرتے ہیں مدینے میں دفن ہونے کی آرزو کرتے ہیں، لیکن وہ مدینہ منورہ کو چھوڑ کر نکلے۔ ان میں سے کوئی فارس میں دفن ہے تو کوئی عراق میں۔ کوئی شام میں ہے تو کوئی مصر میں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کے میزبان حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہما قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے دفن ہیں۔ اس لیے کہ ان حضرات کے پیش نظر دین کو بھیلانا تھا۔

یہ حدیث امام ترمذی اور امام دارمی نے اپنی اپنی سنن میں اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے ”شعب الایمان“ میں نقل کی ہے۔ حرید برآں مست احمد اور مجرم کبیر طبرانی میں یہ مختلف اعزاز میں آئی ہے۔ حدیث کا آغاز اس طور سے ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((اتانی جبریل الطیّب فقال: یا مُحَمَّدُ إِنَّ أُمَّتَكَ مُخْتَلِفَةٌ بَعْدَكَ)) ”میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد ﷺ! آپ کی امت آپ کے بعد اختلاف کا شکار ہو جائے گی۔“ ((قَالَ فَقُلْتُ: فَايَنَ الْمَخْرُجِ يَا جَبْرِيْلُ؟)) ”آپ نے فرمایا کہ میں نے دریافت کیا: اے جبرائیل! تو (اس اختلاف سے) نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟“ ((قَالَ فَقَالَ: كِتَابُ اللَّهِ تَعَالَى.....)) ”آپ نے فرمایا کہ جبرائیل نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ کی کتاب.....“ اس روایت کی رو سے اس حدیث کے راوی اول حضرت جبرائیل علیہ السلام، راوی ثانی محمد رسول اللہ ﷺ اور راوی ثالث حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

عظمت قرآن کے موضوع پر یہ عظیم حدیث میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ آپ اس حدیث کا متن اور ترجمہ اپنے پاس محفوظ کر لیں، بلکہ ایمینیشن کرا کے نمایاں جگہ پر لٹکالیں اور کوشش کریں کہ یہ آپ کو یاد ہو جائے۔

اقول قولی هذا واستغفر اللہ لی ولکم وللسائر المسلمین والمسلمات

(قرآن مجید کی عظمت و فضیلت پر مبنی تہذکرہ بالا حدیث کا

مکمل متن اور اردو ترجمہ اگلے صفحات پر ملاحظہ کیجیے۔)

قرآن مجید کی عظمت و فضیلت

عَنْ عَلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: ((أَلَا إِنَّهَا سَتَكُونُ فِتْنَةً)) قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ؟ قَالَ: ((كِتَابُ اللَّهِ فِيهِ نَبَأٌ مَا قَبْلَكُمْ وَخَيْرٌ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمٌ مَا بَيْنَكُمْ هُوَ الْفَضْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَارٍ فَصَمَهُ اللَّهُ، وَمَنْ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللَّهُ، وَهُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ، وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ، هُوَ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرِّدَّةِ وَلَا تَنْقُصُهُ عَجَابِيَةٌ، هُوَ الَّذِي لَمْ تَنْتَهِ الْجِنَّ إِذْ سَمِعَتْهُ حَتَّى قَالُوا: (إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ) مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ، وَلَمْ يَنْ عَمِلْ بِهِ أَجْرًا، وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ، وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هَدَى إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ))

(رواه الترمذی والدارمی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے ایک دن فرمایا: آگاہ ہو جاؤ ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے! میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس فتنہ کے شر سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "کتاب اللہ! اس میں تم سے پہلی امتوں کے (سہل آموغ) واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں (یعنی اعمال و اخلاق کے جو ذہنوی و اخروی نتائج و ثمرات مستقبل میں سامنے آنے والے ہیں) قرآن مجید میں ان سب سے بھی آگاہی دے دی گئی ہے! اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں ان کا حکم اور فیصلہ موجود ہے۔ (حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں) وہ قولِ حق ہے وہ فضول بات اور یا وہ گوی نہیں ہے۔ جو کوئی جاہر و

سرکش اس کو چھوڑے گا (یعنی غرور و سرکشی کی راہ سے قرآن سے منہ موڑے گا) اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا اور جو کوئی ہدایت کو قرآن کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی (یعنی وہ ہدایت حق سے محروم رہے گا!) قرآن ہی جبل اللہ العتین (یعنی اللہ نے تعلق کا مضبوط وسیلہ) ہے! اور محکم نصیحت نامہ ہے اور وہی صراط مستقیم ہے وہی وہ حق بین ہے جس کے اتباع سے خیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں اور زبانیں اس کو گڑ بڑ نہیں کر سکتیں (یعنی جس طرح اگلی کتابوں میں زبانوں کی راہ سے تحریف داخل ہو گئی اور محرفین نے کچھ کا کچھ پڑھ کے اس کو محرف کر دیا اس طرح قرآن میں کوئی تحریف نہیں ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے تاقیامت اس کے محفوظ رہنے کا انتظام فرما دیا ہے!) اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے (یعنی قرآن میں تدبیر کا عمل اور اس کے حقائق و معارف کی تلاش کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا اور کبھی ایسا وقت نہیں آئے گا کہ قرآن کا علم حاصل کرنے والے محسوس کریں کہ ہم نے علم قرآن پر پورا عبور حاصل کر لیا اور اب ہمارے حاصل کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ بلکہ قرآن کے طالبین علم کا حال ہمیشہ یہ رہے گا کہ وہ علم قرآن میں جتنے آگے بڑھتے رہیں گے اتنی ہی ان کی طلب ترقی کرتی رہے گی اور ان کا احساس یہ ہوگا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو ابھی ہم کو حاصل نہیں ہوا ہے) اور وہ (قرآن) کثرت مزاولت سے کبھی پرانا نہیں ہو گا (یعنی جس طرح دنیا کی دوسری کتابوں کا حال ہے کہ بار بار پڑھنے کے بعد ان کے پڑھنے میں آدی کو لطف نہیں آتا قرآن مجید کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے وہ جتنا پڑھا جائے گا اور جتنا اس میں تفکر و تدبیر کیا جائے گا اتنا ہی اس کے لطف و لذت میں اضافہ ہوگا!) اور اس کے عجائب (یعنی اس کے دقیق و لطیف حقائق و معارف) کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن کی یہ شان ہے کہ جب جنوں نے اس کو سنا تو بے اختیار بول اٹھے: ”ہم نے قرآن سنا جو عجیب ہے رہنمائی کرتا ہے بھلائی کی پس ہم اس پر ایمان لے آئے۔“ جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا۔ اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہو گئی!“

(ترجمہ معارف المحدث از مولانا محمد منظور نعمانی)